نگار

قیمت ۸/

تصانیف حضرت نیاز فتحپوری

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ۔ نگارستان نے ملک میں جو درجہ قبولیت حاصل کیا اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ اس کے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے قیمت علاوہ محصول عہ

گہوارۂ تمدن

مولانا نیاز کی وہ معرکۃ الآرا کتاب جس میں تاریخ اور اساطیر سے ثابت کیا گیا ہے کہ ارتقاء تمدن میں عورت نے کتنا زبردست حصہ لیا ہے اور دنیائے تہذیب و شائستگی اسکی کس قدر ممنون ہے اُردو میں بالکل پہلی کتاب ہے قیمت علاوہ محصول عہ

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اُردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے اسکی زبان اسکی تخیل اسکی نزاکت بیان اسکی بلندی مضمون اور اسکی انشاء عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہنچی ہے قیمت علاوہ محصول عہ

فراست السید

مولانا نیاز فتحپوری جس کے مطالعہ سے ایک شخص بآسانی ہاتھ کی شناخت اور اسکی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل سیرت عروج و زوال موت و حیات صحت و بیماری شہرت و بدنامی وغیرہ کے متعلق صحیح پیشین گوئی کر سکتا ہے قیمت علاوہ محصول عہ

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ حُسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اسکے ایک جملہ میں موجود ہیں۔ یہ افسانہ اپنے پلاٹ اور انشاء کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ مل نہیں سکتی قیمت علاوہ محصول ۱۰ر

جذبات بھاشا

جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کر کے انکی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہو جاتا ہے اُردو میں اپنی سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی ہے زبان بلندی کلام کے لحاظ سے اعلیٰ نمونے ہیں قیمت علاوہ محصول عہ

صحابیات

جس میں عہد سعادت کی ۵۰ خواتین کے مستند حالات پیدا کر دئے گئے ہیں اسکا مقدمہ مولانا نے خاص اپنی انشاء میں لکھا ہے اس کتاب میں سیر الصحابیات سے زیادہ صحابیات کے حالات درج ہیں طباعت و کتابت نہایت نفیس ہے قیمت علاوہ محصول عہ

نقاب اُٹھ جانیکے بعد

تین افسانوں کا مجموعہ جنہیں بنایا گیا ہے کہ ہر وہ چیز جو چمکتی ہے سونا نہیں۔ زبان و پلاٹ انشاء و تخیل کے لحاظ سے تعریف فضول ہے اور حضرت نیاز کا نام کافی ضمانت ہے قیمت ۵ر علاوہ محصول

مذاکرات نیاز

یعنی حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات و تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے ایک بار اس کو شروع کر دینا اخیر تک پڑھ لینا ہے۔ اس کتاب کی بہت کم جلدیں باقی رہگئی ہیں۔ قیمت ۱۲ر علاوہ محصول

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے تین علمی مضامین شامل ہیں ۱۔ چند گھنٹے فلاسفہ قدیم کی روحوں کے ساتھ ۲۔ اوثمین کا مذہب ۳۔ حرکت کے کرشمے نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے قیمت عہ علاوہ محصول

تاریخ الدولتین

جرجی زیدان کے تاریخ تمدن الاسلام کی چوتھی جلد کا ترجمہ جس میں عہد بنی اُمیہ و بنی عباس کی سیاسیات پر بے مثل تبصرہ کیا گیا ہے۔ جرجی زیدان کی یہ کتاب بین الاقوامی شہرت حاصل کر چکی ہے قیمت عہ علاوہ محصول

المسئلۃ الشرقیہ

معرکۂ کامل پاشا کی شہرۂ آفاق کتاب کا ترجمہ یہ وہ کتاب ہے جس نے یورپ و ایشیا کے سیاسیات میں بالجمل زلزلہ سا پیدا کر دیا تھا۔ یہ ترکی و مصر سب سے پہلے ترکی و مصر عرب و حجاز میں انقلاب کی روح پھونکی قیمت عہ علاوہ محصول

دیگر مصنفین کی قابل مطالعہ کتابیں

تذکرۂ خندۂ گل

مولفہ عبدالباری آسی جس میں ۳۰۰ صفحات سے زاید اُردو فارسی کے ظریف شاعروں کے حالات مع انکے طائف و ظرائف و انتخابات کلام کے درج ہیں قیمت عہ محصول عہ

مثنوی لالہ رُخ

طامس مور کی معرکۃ الآرا مثنوی کا مکمل ترجمہ ادبی شاہکار کا بے مثل نمونہ قیمت عہ محصول عہ

مثنوی زہر عشق

مرثیۂ مجنوں گورکھپوری جسمیں ملک کے چار بہترین ادیبوں کا مقدمہ شامل ہے اور کئی تصویریں دی گئی ہیں بکمال تصویر رنگین ہے۔ عہ

فراست التحریر مکمل

یعنی اُردو اور انگریزی رقم خط اور انداز تحریر دیکھ کر ایک شخص کی سیرت چال چلن مستقبل اور تمام حالات معلوم کرنے کا فن اُردو میں بالکل پہلی کتاب قیمت ۸ر علاوہ محصول۔

نگار

رسالہ ہر مہینے کی ۵ ار تاریخ تک شائع ہوتا ہے
رسالہ نہ پہونچنے کی صورت میں ۲۵ ر تاریخ تک دفتر میں اطلاع ہونی چاہیئے ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ ہوگا
سالانہ قیمت پانچ روپیہ (صرف) ششماہی تین روپیہ
بیرون ہند سے آٹھ روپیہ سالانہ پیشگی مقرر ہے

جلد ۲۵	فہرست مضامین مارچ سنہ ۱۹۳۴ء	شمارہ ۳

ملاحظات ——— ۲
زبان اُردو کے ارتقائی منازل ——— عبد المالک آروی ——— ۹
زبان بے زبانی ——— اختر حسین رائے پوری ——— ۱۸
وحی کی حقیقت علمی نقطۂ نظر سے ——— قاضی محمد عزیز عرفانی ——— ۲۰
انگلستان میں سیاسی پارٹیوں کا قیام ——— ڈاکٹر سید نجم الدین احمد جعفری بار ایٹ لا ——— ۲۴
جشن ——— محمد اسحاق امرتسری ——— ۳۹
ملکہ نورجہاں تاریخ کی صحیح روشنی میں ——— شاہ محمد زہیر زبیری ——— ۵۰
باب الانتقاد ——— ۵۸
باب الاستفسار ——— ۶۴
باب المراسلۃ والمناظرہ ——— ۶۸
انسان (نظم) ——— علی اختر (حیدرآباد دکن) ——— ۷۸
خوابستان محبت (نظم) ——— روشن صدیقی ——— ۷۹

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد ۲۵	مارچ ۳۴ء	شمارہ ۳

ملاحظات

" تو خود حدیث مفصل بخواں ازیں مجمل "

گزشتہ و آیندہ ——

آفتاب کا طلوع و غروب ، روز و شب کا تسلسل ، اور اسی طرح کے تمام فطری مناظر زمانہ نامعلوم سے یکساں طور پر رونما ہوتے چلے آرہے ہیں ، اور اگر کائنات نام صرف انھیں نقوش کا ہو تو ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ دنیا کسی انقلاب و تغیر کو قبول نہیں کرتی ۔ لیکن حقیقت امر شاید اس کے خلاف ہے کیونکہ اہل علم پورے یقین کے ساتھ کہتے ہیں کہ " عالم حادث ہے ، متغیر ہے " ——

پھر کیا اس حدوث و تغیر کا علم ہم کو بغیر کسی غور و فکر کے الہامی طور پر حاصل ہوا ہے ۔ غالباً نہیں ۔ پھر اس بات کے تسلیم کرنے میں کیوں تامل ہو کہ اہم ترین تغیر عقل انسانی کا تغیر ہے جو ہر آن و ہر لحظہ حجابات دور کرتا جا رہا ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ آیندہ کس نقطہ پر پہونچ کر اس کو اپنی تگ و دو ختم کرنا ہے ۔

انسان فطرت کی طرف سے اپنے اندر وہ حس لیکر آیا ہے جسے "حس اجتماعی" (Herd Instinct) کہتے ہیں اور اسی احساس کا نتیجہ نظامِ تمدن ہے جس کا آغاز "عہدِ حجری" سے ہوا اور اب "عہدِ برق و شعاع" کہلاتا ہے، یعنی جس کی ابتدا زمین کے جمادات سے ہوئی تھی وہ اب آسمان سے باتیں کر رہا ہے ــــ اور کون کہہ سکتا ہے کہ آئندہ وہ اس سے بھی بلند گزر کر "عرشِ کبریائی" تک نہ پہونچ جائے گا ــــــ الغرض اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ ذہن انسانی برابر ترقی کرتا جا رہا ہے اور کل کے بوڑھے آج صرف بچوں کی صف میں جگہ پا سکتے ہیں ــــــ جس طرح آج کے بوڑھوں کا شمار کل کے بچوں میں ہونے والا ہے۔

پھر کیا یہ انسان کی توہین ہے کہ اب سے ہزار سال قبل جو تحقیق و جستجو اس نے کی تھی وہ آج غلط ثابت کی جا رہی ہے: اگر ہمارے اسلاف کے علمی، اخلاقی و تمدنی نظریے آج کے مشاہدہ و ضروریات کے لحاظ سے ناقص و نامکمل نظر آتے ہیں، تو کیا اس کا اظہار ان کی تنقیص ہے؟

نظامِ بطلیموس کا ماننے والا آج کوئی نہیں، لیکن بطلیموس کی عزت و عظمت اسی طرح قائم ہے، نیوٹن کا نظریہ کشش ممکن ہے "انیشٹین" کے نظریۂ اضافیت کے سامنے غلط ثابت ہو جائے، لیکن نیوٹن کا نام تاریخ کے صفحات پر ہمیشہ زریں حروف میں نظر آئے گا

جس طرح ازمنۂ قدیمہ میں انسانی ذہن و دماغ نے اپنے حاسۂ اجتماعی کے اقتضا پر اور بہت سی باتیں دریافت کیں، اسی طرح اس نے مذہب کی بنیاد ڈالی اور ــــــ اس میں شک نہیں کہ اس سے اُس کا مقصود نوعِ انسان کی خدمت اور تشکیلِ تمدن کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ پھر اگر ضروریاتِ زمانہ اور انسان کی عقلی ترقیوں کے ساتھ ساتھ دنیا کی تمام علمی نظریے تبدیل ہوتے رہتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ مذہبی عقائد میں تغیر نہ پیدا ہو۔ لیکن اس تغیر کا مطالبہ و احساس یقیناً کسی پیمبر کی توہین نہیں، کیونکہ جس عہد و زمانہ میں جو مذہب پیدا ہوا وہ اس وقت کے لحاظ سے واقعی آخری لفظ کی حیثیت رکھتا تھا۔ قرآن پاک میں بھی ارتقاءِ خیال کے لحاظ سے اصولِ مذاہب کی تبدیلی کی ضرورت کو ان الفاظ میں ظاہر فرمایا گیا ہے:-

ما ننسخ من اٰیۃ او ننسھا نات بخیر منھا او مثلھا

جب حقیقت یہ ہے تو میں حیران ہوں کہ عقاید مذہبی میں تغیر و تبدل کی خواہش پر لوگ کیوں چراغ پا ہوتے ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ مسلمان۔ کہ ان کے مذہب کی بنیاد ہی اس اصول پر قائم ہوئی ہے کہ "خُذ ما صفا" پر عمل کیا جائے اور زمانہ کے ساتھ دینے کی اہلیت اپنے اندر پیدا کی جائے

مذاہب عالم کی تاریخ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک چیز تو وہ تھی جسے ہم "پیمبرانہ روح" (Prophet Soul) کہتے ہیں اور دوسری جو اس کے بعد پیدا ہوئی وہ "نفس مولویانہ" (Priest Mind) تھا۔ یعنی ایک تو وہ نفوسِ پاکیزہ تھے جن کے ذہن خلاق نے انسانی سوسائٹی کی فلاح کے لیے کچھ اصول وضع کئے اور دوسرے

وہ تھے جو ان کا نفاذ کرنے والے تھے اور نقال محض ـــ پھر ان میں سے اکثر وہی تھے جنھوں نے اس پیمبرانہ رُوح کے حقیقی منشا سے ناآشنا رہ کر محض الفاظ کو لے کر ان کی پرستش شروع کر دی اور کمتر ایسے تھے۔ جن کے دماغوں نے ہادی اوّل کی عقلِ سلیم کے متوازی چل کر اس کی تعلیم کی کنہ حقیقت کو دریافت کیا ہو ـــــــ یہی رونا پہلے بھی تھا اور آج بھی ہے۔ اور اسی لئے اس سے قبل بھی عقل و مذہب میں جنگ جاری رہی۔ اور اب بھی جاری ہے۔ فرق اگر ہے تو صرف اتنا کہ پہلے ذہن و عقل کی اس آزادی کو بزورِ شمشیر فنا کر کے اسے زیادہ ابھرنے کا موقع نہیں دیا جاتا تھا۔ اور آج یہ مجبوری اٹھ جانے سے عقل انسانی زیادہ سنگین محاذ قائم کرنے میں کامیاب ہو گئی ہے اب آئیے اس جنگ پر ذرا اور وضاحت کے ساتھ روشنی ڈالیں

اہل سائنس کہتے ہیں کہ سائنس ہمیں صرف اُن باتوں کے یقین کرنے پر مجبور کرتا ہے جن کو ہم صحیح ثابت کر سکتے ہیں، برخلاف اس کے مذہب مشتمل ہے چند مزعومات پر جن کا کوئی علمی یا استقرائی ثبوت پیش نہیں کیا جا سکتا۔ اور اگر اہل مذاہب سے سوال کیا جاتا ہے کہ اُن کی باتوں پر ایمان لانے کے کیا اسباب ہیں تو وہ تین دلیلیں پیش کرتے ہیں۔ ایک یہ کہ ہمارے اسلاف ایسا ہی یقین کرتے تھے، دوسرے یہ کہ ہمارے اسلاف جو دلائل پیش کر چکے ہیں وہ کافی ہیں اور تیسرے یہ کہ اصول مذہب پر گفتگو کرنا ناجائز و ممنوع ہے ـــــــ کیا یہ دلائل واقعی کوئی وزن رکھتے ہیں ؟

اگر دو ہزار قبل مسیح کے اکتشافات علمیہ کو عقل انسانی نے آج بالکل بدل کر رکھ دیا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اُس وقت کا مذہب جوں کا توں باقی رہے اور اس کے اصول اب بھی مفید و کارآمد ثابت ہوں۔ پھر اگر تمام دنیا میں صرف ایک ہی مذہب ہوتا تو بھی کہا جا سکتا تھا کہ وہ ایک ایسی حقیقت ہے جس میں کبھی اختلاف پیدا ہی نہیں ہوا، لیکن جب دنیا میں سیکڑوں مذاہب قائم ہوئے اور ہر ایک نے سوائے اپنے تمام دیگر مذاہب کو جھٹلایا تو ایک طلبگارِ حق کے لئے چارہ کار صرف یہ رہ جاتا ہے کہ وہ ان سب کو عقل کی کسوٹی پر کسے اور کسی ایک کی صحت پر ایمان لائے۔ اس لئے یہ کہنا کہ مذہب کا تعلق عقل سے نہیں کیونکر درست ہو سکتا ہے ـــــــ

یہ بات صحیح ہے کہ سائنس اس وقت تک کسی ایسی حقیقت راسخہ تک نہیں پہونچ سکا جس کے آگے بڑھنے کی گنجائش باقی نہ رہے، لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ جو دن گزرتا ہے وہ اس حقیقت سے قریب تر ہوتا جا رہا ہے اور اسی لئے کوئی وجہ نہیں کہ مذہب کے باب میں اس اصولِ ارتقاء کو نظر انداز کر دیا جائے

سائنس واقعات کی جستجو کر کے حقیقت تک پہونچنا چاہتا ہے اور مذہب چند باتوں کو پہلے ہی سے حقیقت باور کر کے واقعات کو ان پر منطبق کرنا چاہتا ہے اور ان دونوں کا فرق ظاہر ہے ـــ اگر ہم کسی مذہب کے پیرو ہیں تو صرف اس وجہ سے کہ ہمارے آبا و اجداد اس مذہب کے ماننے والے تھے، لیکن سائنس کے یہاں باپ دادا کوئی چیز نہیں، وہ ہر انسان سے انفرادی طور پر عقل و تمیز کے استعمال کا مطالبہ کرتا ہے

عقل انسانی نے عقاید مذہب میں جس جس تغیر کو قبول کیا وہ اہل علم سے مخفی نہیں۔ ابتدائی حالت میں جب انسان وحشی

وجاہل تھا وہ خدا کو ایک ایسی ہی خود مختار فرمانروا ہستی سمجھتا تھا جیسی کسی دنیاوی صاحب وجبروت بادشاہ کی ہوتی ہے کہ نہ وہ کسی قانون کا پابند ہے نہ کسی اصول پر کاربند جو اور جس طرح چاہتا ہے بناتا بگاڑتا رہتا ہے ـــــ اس کے بعد جب سترہویں صدی میں ڈیکارٹ، کیپلر، گلیلو، اور نیوٹن پیدا ہوئے اور انھوں نے کائنات کو ایک بڑی مشین کی طرح نظم واصول کے ساتھ چلتے ہوئے تسلیم کیا تو خدا کے اس قدیم عقیدہ میں بھی کچھ تبدیلی پیدا ہوئی اور لوگوں نے باور کیا کہ دنیا کا کاروبار بیشک خدا چلاتا ہے لیکن مخصوص مشنیری کے ذریعہ سے جس کو اس نے پیدا کیا ہے۔ مدعا یہ کہ خدا کی خدائی کسی قانون واصول کی پابند ضرور ہے۔ جب یہ دور بھی ختم ہوا اور اٹھارویں صدی آئی تو اس مشنیری میں کسی خارجی قوت کی مداخلت کو بھی تسلیم نہ کیا گیا مدعا یہ کہ خدا حکمراں تو ہے لیکن نظم ونسق سے اسے کوئی واسطہ نہیں ـــــ زمانہ حال کی جو کیفیت ہے وہ سب پر ظاہر ہے کہ سرے سے خدا کا وجود ہی معرض خطر میں پڑ گیا ہے ـــــ بہرحال یہ واقعہ ہے کہ دیگر علوم وفنون کے ساتھ مذہبی نظریوں میں بھی غیر معمولی تغیر پیدا ہوا اور وہ وقت آنے والا ہے جب اس کی انتہا اس صورت میں ظاہر ہوگی جو اس وقت رُوس میں نظر آرہی ہے یعنی یہ کہ مذہب کا نام لینا ہی گناہ سمجھا جائے گا اور جس طرح کسی وقت دین نے بیدینی کا استیصال تیغ وخنجر سے کیا تھا، بالکل اسی طرح بیدینی، دین کو محو کر دینے کی کوشش کرے گی ـــ کیونکہ اس وقت مذہبی اہمیت صرف سیاسیات کے رجحان پر قائم ہے اور اس کی حیثیت سرمایہ دارانہ پروپاگنڈا سے زیادہ باقی نہیں رہی

جس حد تک روحانیت کا تعلق ہے مذہب، جس میں ظاہری مراسم وشعائر کی پابندی ضروری ہے، کوئی معنی نہیں رکھتا، مادی نقطۂ نظر سے اس کی ناکامی کسی سے مخفی نہیں کہ آج تک وہ قوی کے مقابلہ میں ضعیف کو پامالی سے نہ بچا سکا؛ نفسیاتی زاویۂ نگاہ سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اس کی خصوصیات، علمی وتمدنی ترقی کے لئے بہت حارج ہوئیں۔ رہی وجدانی ومابعد الطبیعیاتی تسکین سو یہ علم واخلاق کی وسعت سے حاصل ہو سکتی ہے جو عام "اخوت انسانی" کے رشتہ کو قائم کرنا چاہتی ہے ـــــ الغرض اس وقت ..... مغرب کی علمی دُنیا میں جو جدید مذہب پھیلتا جا رہا ہے وہ "اشتراکیت" ہے جس کا پیغمبر لینن اور جس کی شریعت سائنس ہے۔ [1]

پھر مذہبی نظام کے خلاف یہ ہیجان صرف یوروپ وامریکہ ہی میں محدود نہیں ہے بلکہ ایشیا میں بھی پایا جاتا ہے تُرکی اپنی قومی ترقی واصلاح کے لئے اسلام کو پس پشت ڈال رہا ہے، چنانچہ ۱۹۲۷ء میں مصطفےٰ کمال نے اپنی ایک تقریر

---

[1] ماسکو کے کلب میں جو کتبے آویزاں ہیں اُن میں سے ایک پر یہ عبارت درج ہے:-

"کسی کو خبر نہیں کہ دُنیا کب بنی لیکن یہ ہر شخص جانتا ہے کہ نئی دنیا ۱۹۱۸ء میں پیدا ہوئی ـــ آسمانوں سے خدا کو ہٹاؤ اور زمین سے سرمایہ داری کو تاکہ اشتراکی نوجوانوں کو آگے بڑھنے کا موقعہ ملے"

کے دوران میں صاف صاف کہدیا تھا کہ " کانسٹی ٹیوشن میں اس امر کا اظہار کہ ترکی، اسلامی حکومت ہے ایک ایسی بات کا اظہار ہے جس کو اولیں مناسب فرصت میں کالعدم ہوجانا ہے"——— یہی حال تقریباً ایران و مصر کا ہے۔ چین اور ہندوستان میں بھی اس انقلاب کے آثار پوری طرح نمایاں ہیں کیونکہ اس وقت دنیا کے سامنے اہم ترین فکر یہ نہیں ہے کہ انسان گناہوں سے کس طرح باز رہے بلکہ یہ ہے کہ تمدنی و معاشری نظام میں کونسی ایسی تبدیلی پیدا کی جائے کہ انسان بھوکا نہ مرے۔ اور چونکہ مذاہب عالم کا موجودہ نظام انسانیت کے اس درد دکھ کا علاج اب تک نہیں کرسکا۔ اس لئے لامحالہ یا تو اس کو پس پشت ڈالنا پڑے گا یا اس میں کوئی ایسا تغیر پیدا کیا جائے گا۔ جو اس گتھی کو سلجھا سکے۔ بہرحال اس دورِ انقلاب میں مذاہب کو ضرور صدمہ پہونچے گا۔ اور اگر حامیان مذہب نے اپنے اصولِ کار میں اقتضاءِ زمانہ کے لحاظ سے کوئی تبدیلی پیدا نہ کی تو ان کا منصب شریعت سے ہٹ جانا ناگزیر ہے

اگر شخص ثالث کی حیثیت سے فیصلہ کیا جائے تو اس سے انکار ممکن نہیں کہ موجود مذاہب میں، صرف اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو زمانہ کے موجودہ انقلاب میں زندہ رہنے کی صلاحیت رکھتا ہے، بشرطیکہ اس کی اصل رُوح کو پیش کیا جائے اور ظاہری شعائر و مراسم کی پابندی پر زور نہ دیا جائے

اس وقت اصولاً تقریباً تمام ممالک نے اس بات کو تسلیم کرلیا ہے کہ حکومت و سلطنت کی بہترین صورت جمہوریت ہے اور سرمایہ دارانہ ذہنیت نے جو مصائب دنیا پر توڑ رکھے ہیں ان کا علاج سوائے اشتراکی اصول کے اور کوئی نہیں ہوسکتا پھر کیا سوائے اسلام کے دوسرا مذہب کوئی اور ہے جو اس بات کا حامی ہو۔ سوال نہ بنو عباس کا ہے نہ بنو امیہ کا، نہ دولت فاطمیہ کا نہ ہندوستان کے دورِ مغلیہ کا بلکہ غور طلب امر صرف یہ ہے کہ اسلام کی اصل تعلیم کیا ہے۔ اگر عہد رسالت کے بعد اس پر عمل نہ کرکے لوگوں نے بجائے جمہوریت کے مستبدانہ حکومتوں کی بنیاد ڈالی ہو تو اسلام مورد الزام نہیں ٹھہرتا اور اگر آج بھی اس تعلیم کو پیش نہیں کیا جاتا تو اس میں قصور ہمارے قائدین مذہب کا ہے نہ کہ اسلام کا

تمام نوع انسانی کو ایک مرکز پر لانے کے لئے جو جذبہ عملاً کوئی خدمت کرسکتا ہے وہ " اخوت عامہ " کا جذبہ ہے اور اگر اس کے خلاف کوئی تعلیم پیش کی جاتی ہے (خواہ وہ اصول سے تعلق رکھتی ہو یا فروع سے، شعائر سے وابستہ ہو یا عقائد سے) کبھی صحیح اسلامی تعلیم نہیں ہوسکتی

اس وقت اسلام کے اصطلاحی معنی خواہ کچھ ہی کیوں نہ قرار دے لئے گئے ہوں، لیکن حقیقتاً وہ ایک ایسا بسیط مفہوم رکھتا ہے کہ اس کو ہم کسی طرح محدود کر ہی نہیں سکتے کیونکہ اسلام نام ہے صرف استعلار کا، عروج و ترقی کا، جدوجہد کا، کردار و عمل کا، ایک ایسی " لامذہبیت " کا جو تمام مذاہب کو ایک مرکز پر لانے کی اہلیت رکھتی ہے۔ اور شعائر و مراسم سے بے نیاز ہوکر صرف پاکیزگی اخلاق اور تکمیل تمدن کی حامی ہے

پھر چونکہ اس نکتہ کو مسلمان فراموش کرچکے ہیں اور مذہب کی صحیح تعلیم کو انسان کی خودغرضانہ ذہنیت خراب کرچکی

ہے، اس لئے عام طور پر یہی باور کیا جاتا ہے کہ یہ ساری خرابیاں تعلیم مذہب کی ہیں اور اسی بناء پر تمام اسلامی ممالک میں وہ ردِ عمل ظاہر ہو رہا ہے جس کا دوسرا نام کفر و ارتداد رکھا گیا ہے۔ لیکن یاد رکھیئے کہ یہ حالت عرصہ تک قائم نہ رہے گی اور اس انقلاب کا نتیجہ یقیناً استیصال مذہب کی صورت میں ظاہر ہوگا اگر اس کے اصلی خط و خال پیش نہ کئے گئے

ممکن ہے جو مفہوم میں نے اسلام کا پیش کیا ہے وہ اس وقت تعجب و نفرت کی نگاہ سے دیکھا جائے، لیکن وہ وقت آنے والا ہے، جب ایک ایک شخص وہی کہے گا جو میں کہہ رہا ہوں۔ اور اسلام تمام دنیا پر حاوی ہو کر رہے گا

پھر ہو سکتا ہے کہ اس کی صورت دوسری ہو، اس کا نام کچھ اور ہو، لیکن اس کا مفہوم وہی ہوگا جو آج میں کہہ رہا ہوں اور اُس کے خد و خال وہی ہوں گے۔ جنھیں آج میرا قلم پیش کر رہا ہے

صوبۂ بہار میں تعمیرِ مساجد کا بے محل سوال

اس وقت صوبۂ بہار جس دردناک تباہی میں مبتلا ہے، اس کی حقیقت کسی سے مخفی نہیں اور یہ بھی سب کو معلوم ہے کہ ہندوستان کے ہر گوشہ سے امداد و ہمدردی کے جذبات ظاہر کئے جا رہے ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ اس وقت تک جو اعانت کی گئی ہے وہ ہندوستان ایسے وسیع ملک کو دیکھتے ہوئے کسی طرح قابلِ ستایش نہیں سمجھی جا سکتی اور ضرورت ہے کہ ہر ادارہ اور ہر انجمن عملاً اس میں حصہ لے اور ہر وہ شخص جو دن میں چار پیسے صرف کر سکتا ہے، ایک پیسہ بچا کر بہار کے مصیبت زدہ انسانوں کے لئے علٰحدہ کر دے۔ خیر یہ صورت تو فراہمی زر کی ہوئی، لیکن اسی کے ساتھ دوسرا اہم سوال اس کے صرف کا ہے۔ یعنی یہ کہ اس رقم کو کس طرح اور کس کام میں خرچ کیا جائے

اس وقت تک صورتِ حال یہ تھی کہ حکومت کے علاوہ چند پرائیویٹ امدادی کمیٹیاں بھی کام کر رہی تھیں اور چونکہ مولویوں کا عنصر ان میں شامل نہ تھا اس لئے صحیح اصول پر کام ہو رہا تھا، لیکن اب یہ دیکھ کر کہ ہمارے علماء کرام بھی اس میں حصہ لینے کے لئے آمادہ ہو گئے ہیں اور مسمار شدہ مساجد کی تعمیر کے لئے اپنی جھولیاں لے کر نکل کھڑے ہوئے ہیں، ہمیں "اندیشہ ہائے دور و دراز" پیدا ہو گئے ہیں اور اگر ابھی سے اس کا سدِ باب نہ کیا گیا تو ملک کا بہت سا روپیہ بیکار ضائع جائے گا

حال ہی میں ایک اپیل ان علماء کرام کی طرف سے شائع ہوئی ہے جس میں مسلمانوں کو صوبۂ بہار کی تباہ شدہ مساجد کی طرف متوجہ کر کے چندہ طلب کیا گیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ صوبۂ بہار کی مسجدیں بالکل تباہ و برباد ہو چکی ہیں اور یہ بھی درست ہے کہ ان کی تعمیر و مرمت ایک حد تک ضروری ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ جب نماز پڑھنے والے ہی وہاں نہ ہوں گے تو مسجدیں کس کام آئیں گی ——— اس وقت تو اہم ترین سوال موت و زندگی کا ہے، بھوک پیاس کا ہے تن ڈھانکنے اور سر چھپانے کا ہے، اس لئے جب تک آپ اس سے فارغ نہ ہو جائیں مسجد و خانقاہ پر توجہ کرنا اور مدرسہ و مقابر پر روپیہ صرف کرنا حد درجہ لایعنی بات ہے

اگر مسلمان اس صدمہ و تباہی سے جانبر ہو گئے تو وہ اُس خدا کی پوجا جس نے انھیں زلزلہ کی مصیبت میں گرفتار کیا تھا، کھلے ہوئے میدانوں اور جھونپڑوں میں بھی کر لیں گے، لیکن اگر وہ بھوک پیاس سے مر گئے تو پھر کیا مولوی لوگ بغیر مقتدیوں کے ان مساجد میں امامت کریں گے

جو رقم کسی ایک مسجد کے تعمیر یا مرمت میں صرف ہو گی، اُس سے ہزار بھوکوں کو کھانا کھلایا جا سکتا ہے، اس لئے بہ حالتِ موجودہ انسانی تباہیوں پر مساجد کی تباہی کو ترجیح دینا اور لوگوں کی توجہ کو بجائے حیات انسانی کے اینٹ اور چونہ کی طرف مائل کرنا۔ نہ یہ کہ خلاف عقل ہے بلکہ اقتضا، مذہب کے بھی منافی ہے۔ اور پھلواری شریف میں جو مرکزی کمیٹی تعمیر مساجد کے لئے قائم ہوئی ہے اسے توڑ دینا چاہئے کیونکہ ایک پیسہ بھی اس وقت اس کام میں صرف کرنا عقلاً و شرعاً دونوں طرح ناجائز ہے

مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ کوئی رقم ایسی کمیٹیوں کو نہ دیں جو تعمیر مساجد کے لئے قائم ہوئی ہیں کیونکہ ابھی یہ کام بالکل قبل از وقت ہے۔ اور سب سے پہلے ہمیں اُن یتیم بچوں کی پرورش کی طرف متوجہ ہونا ہے جو پڑے ہوئے سسک رہے ہیں، اُن بیواؤں کی اعانت کرنا ہے جن کا کوئی سر دھرا موجود نہیں اور اُن ضعیفوں کی مدد کو پہونچنا ہے جن کے جوان جوان بیٹے نذرِ اجل ہو چکے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ تعمیر مساجد کے سلسلہ میں، بہت سے مزدور کام سے لگ جائیں گے، لیکن کیا مکانات کی تعمیر سے یہ فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا، اور کیا دوسرے امدادی کاموں سے روپیہ لوگوں میں نہ پھیلے گا۔

عمدہ قسم کے پودے

تخمی باغات کیواسطے

حجم اور قد میں بڑے سیب کے مانند رنگین آم نہایت لذیذ انواع اقسام کے آم کے پودے اپنی زمینوں پر لگا کر ان کی پیداوار سے معقول فائدہ حاصل کیجئے

دوسالہ عمر کا پودا گملہ میں ۴ر بغیر گملہ ۳ر علاوہ محصول خرچہ وغیرہ

نذیر برادرس ملیح آباد ضلع لکھنؤ

زبان اُردو کے ارتقائی منازل

(سلسلۂ ماسبق)

زبان فارسی کے ہندو ادیب | عہد مغلیہ نے بہت سے ہندو ادیب پیدا کئے، ہندو منصبداروں میں اکثر امرا فارسی زبان میں مہارت رکھتے تھے، اور وہ اپنی اولاد کو فارسی کی تعلیم دلایا کرتے تھے عہد اکبری کے بعد نسلاً بعد نسلٍ یہ سلسلہ قائم رہا۔ چنانچہ عہد جہانگیری میں فارسی زبان کا ایک بہت بڑا ہندو ادیب رائے منوہر بوسی تھا، ابن محمد معصوم الہروی لکھتا ہے،

رائے منوہر بن رائے لون کرن خدمت شاہزادہ اسلیم خط و سواد بہم رسانیدہ شعر میگوید و "بوسی" تخلص دارد" (تاریخ ابن محمد معصوم ہروی)

جہانگیر فارسی ادب میں جو بلند مرتبہ رکھتا ہے، وہ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں اسپر اسکے روزنامچہ (تزک جہانگیری) کی ہر ہر سطر شاہد ہے، مرزا سرخوش نے اسکی عروض دانی کے متعلق ایک عجیب روایت درج کی ہے، (کلمات الشعرا) ایسے ماہر ادیب کی صحبت میں رائے منوہر ادب کے کس نکتہ و رمز سے ناواقف رہا ہوگا؟ عہد شاہجہانی میں ایک ہندو شاعر تھا جو "برہمن" تخلص کرتا تھا۔ مرزا سرخوش لکھتے ہیں

برہمن افضل خانی طبع درست داشت (ہندوان بسیار خنیمت بودہ ..... سلیقۂ انشا پردازی ہم داشت (کلمات الشعرا ص ۲۱)

شاہجہاں نے حکم دیا کہ مشاعرہ ہو، برہمن نے یہ تازہ بیت کہا تھا پڑھ دیا

مرا دلے است بہ کفر آشنا کہ چندیں بار　　بہ کعبہ بردم و بازش برہمن آوردم

اس سے اندازہ ہوتا ہے، کہ برہمن کس پایہ کا شاعر تھا اور یہی نہیں بلکہ مرزا سرخوش کی روایت سے یہ بھی پتہ چلتا ہے، کہ "برہمن" کے علاوہ فارسی کے اور بھی شعرائے ہنود تھے ——— عہد متاخرین میں بھی فارسی کے بہت بڑے بڑے ہندو ادیب شاعر پیدا ہوئے انمیں بھگوان داس ہندی اور بندرابن داس خوشگو بہت بلند درجہ رکھتے ہیں، یہ حضرات نہ صرف نکتہ سنج شاعر تھے، بلکہ معتبر تذکرہ نگار بھی تھے، ان لوگوں نے فارسی کے شعرائے متاخرین و معاصرین کے حالات و کلام سے بحث کی ہے، "سفینہ ہندی" اور "تذکرۂ خوشگو" کے قلمی نسخے پٹنہ اورنٹیل لائبریری میں ہیں یہ کتابیں ہندو مسلمانوں کے روابط اور رجحانات پر کافی روشنی ڈالتی ہیں ان سے پتہ چلتا ہے، کہ فارسی زبان ہندوؤں کے درمیان کس بلند معیار پر رائج تھی

خطاطی | میرے پاس عربی اور فارسی مخطوطات کا ایک مختصر سا مجموعہ ہے، اس میں بعض کتابیں ہندو انشا پردازوں کی تصنیف ہیں، بعض ہندو خطاطوں کی نقل کی ہوئی ہیں تفصیل ملاحظہ ہو،

نادرات الثاقب۔ یہ کتاب فن بلاغت کے متعلق ہے، خط نستعلیق، نہایت ہی پاکیزہ اور جالب نظر ہے رائل سایز کے ۱۲۶ صفحات کو محیط ہے، عنوان سرخ روشنائی سے لکھے ہوئے ہیں مصنف کا نام شیو پرشاد مہاراجہ جے گوپال سنگھ بہادر متخلص بہ ثاقب ہے، اس کتاب پر کئی جگہ خود مہاراجہ صاحب بہادر کی خاص مہریں ثبت ہیں سرورق پر فرمانروائے اودھ واجد علیشاہ کی مہر بھی درج ہے، یہ کتاب سنہ ۱۲۹۰ھ میں لکھی گئی، اور سنہ ۱۲۹۳ھ میں مہاراجہ صاحب نے اپنے ہاتھ سے لکھ کر شہریار اودھ کی خدمت میں پیش کی چنانچہ خود مہاراجہ کے

قلم سے کتاب کے شروع میں یہ عبارت ثبت ہے،

عرضہ داداقل عباد، خانہ زاد ازلی اعتقاد، شیو پرشاد مہاراجہ بے گوپال سنگھ بہادر بالا دبتاریخ نیک دوم شہر ربیع الاول یوم عید الجمعہ،

ابتدا اور آخر میں یہ الفاظ بھی نظر آتے ہیں

"مصنفہ و محررہ دگذرانیدۂ خانہ زاد مورونی"

اس کے بعد آپ کے نام کی مہر درج ہے، مہاراجہ صاحب قوم کالیست سری باستب سے تعلق رکھتے ہیں، آپ کا خاندان شاہان اودھ کے زمانہ میں اعیان و اشراف میں شمار ہوتا تھا آپ کے والد کا نام بینی پرشاد ہے، آپ شیام سندر لال سرشار کے نواسہ ہیں، ثاقب کی یہ کتاب فارسی میں ہے، انھوں نے صنایع و بدایع کے متعلق اس میں بہت سے نقوش بنائے ہیں ساری صنعتوں کی مثال میں ایسے اشعار پیش کئے ہیں جن میں واجد علی شاہ کی مدح ہے، یہ اشعار خود ثاقب کی فکر کا نتیجہ ہیں اس لئے یہ کتاب اور بھی قابل قدر ہے، بلاغت کے متعلق اگلی کتابوں میں متقدمین کے کلام سے لوگوں نے مثالیں پیش کی تھیں، اس سے اندازہ ہوتا ہے، کہ ثاقب بلاغت میں صرف ایک کاتب و ناقل کا درجہ نہیں رکھتے تھے، بلکہ وہ اس فن کے مجتہد کہے جاسکتے ہیں پہلے صفحہ پر ہندو طرز کی ایک تصویر اور گلکاریاں بھی پائی جاتی ہیں،

اقبال نامہ جہانگیری | معتمد خاں نورالدین جہانگیر کا بخشی تھا۔ اس کی یہ تاریخ عہد جہانگیری کے متعلق نہایت دلچسپ و معتبر ہے، اس پر ایک مکمل تبصرہ "نگار" میں ہوچکا ہے، اسی کا ایک قلمی نسخہ ۱۲۲۱ھ میں بمقام کلکتہ مرتب ہوا تھا اس کے آخر میں یہ عبارت درج ہے،

"برائے خاطر عزیز اندرام بہ خط خام گمنام رام سکھ پنڈت"

مجمع الصنایع | یہ کتاب بھی فن بلاغت میں ہے، سنہ ۱۰۶۰ھ اس کی تاریخ تصنیف ہے، فن بلاغت پر اس سے جامع کتاب میری نظر سے نہیں گذری، اس کے پہلے صفحہ پر ایک مہر ثبت ہے، کتابت نہایت عمدہ ہے، اس کے آخری سطور یہ ہیں

"ایں نسخہ فرخندہ آیام مسمیٰ بہ مجمع الصنایع بعزہ ربیع الاول سنہ یکہزار و دو صد و سی و ہشت ۱۱۳۸ ہجری علی صاحبہا افضل الصلوٰۃ والسلام برائے خاطر شریف وطبع لطیف معدن الجود، وحق پرست لالہ صاحب قبلہ جناب لالہ بھوانی دین صاحب ساکن قصبہ بسکھاری بہ خط اذل الانام سالار بخش تجاوز اللہ عنہ سیاتہ بہ اختتام رسید"

شجرۃ الامانی | اس کے مصنف مرزا قتیل ہیں، یہ رسالہ قتیل نے بلاغت و معانی کے متعلق لکھا ہے، اور سید امان علی کے نام سے معنون کیا اسی کا ایک قلمی نسخہ، لالہ بھوانی دین کے ہات کا لکھا ہوا، میرے پیش نظر ہے، اس کی آخری عبارت یہ ہے،

" تمام شد نسخہ شجرۃ الامانی تصنیف مرزا محمد حسن قتیل کاتبہ و مالکہ اضعف العباد بھوانی دین قوم کالیست متوطن قصبہ بکھاری متعلقہ درگاہ کچھوچھہ بتاریخ یازدہ جمادی الثانی سنہ ۱۲۳۶ھ یک ہزار و دو صد و سی و نہ ہجری رقمی یافت "

رسالہ سنہ شمسیہ و قمریہ | یہ کتاب شمسی و قمری سنہ کی تحقیقات کے متعلق ہے، اس کے مصنف قاضی القضاۃ مولنا نجم الدین ہیں اس کا ایک قلمی نسخہ مخطوطہ سنہ ۱۲۳۸ھ لالہ بھوانی دین کے کتبخانہ میں تھا، یہ رسالہ خود لالہ صاحب نے نقل کرایا تھا اسی کے ساتھ دو رسایل اور ہیں ایک فلسفہ پر ہے، جو " زمان و مکان " کے مباحث سے متعلق ہے، دوسرا ضوابط، و آئین عدالت کے متعلق ہے،

ہندوؤں نے مسلمانوں کے ساتھ مل کر نہ صرف تخلیق زبان میں مدد دی بلکہ علوم و فنون کے جس شعبہ پر نظر ڈالئے آپ کو پتہ چلے گا، کہ ہندوؤں نے اس میں ضرور حصہ لیا، شاعری اور اصناف سخن کو چھوڑئے، تصوف، موسیقی، مصوری، تعمیر سارے فنون میں ہندوستانی اثر پایا جاتا ہے،

تصوف | معتمد خاں نے جہانگیر کی فقیر دوستی کے سلسلہ میں ایک دلچسپ روایت لکھی ہے، جلوس کے گیارہویں سال بادشاہ اوجین.... گیا یہاں ایک ہندو سنیاسی کے حالات سنکر بادشاہ خود اس فقیر کے مٹھ پر پہونچا سنیاسی علم ویدانت میں کامل تھا علایق مادی کو یکسر ترک کر چکا تھا، عبادت و ریاضت کے سوا اس کو دنیا سے کوئی سروکار نہ تھا، آبادی سے دور اس کا صومعہ تھا فقیر نے بادشاہ کی پذیرائی کی اور تصوف اسلامیہ اور یوگ (ہندوستانی تصوف) کے اصول و مبادی میں تطبیق دے کر بیان کیا چنانچہ مؤرخ مذکور لکھتا ہے،

" مصطلحات اہل اسلام را باطریق تصوف خود تطبیق دادہ بیان نمود صاحب این مقام را " سرب باشی " میگویند یعنی تارک ہمہ "[1]

اس سے جہاں ہندو فقرا کی اسلامی تصوف سے واقفیت کا پتہ چلتا ہے، وہاں دور مغل کے ابتدائی عہد میں مسلمان ادیبوں کی اس کاوش کا بھی حال معلوم ہوتا ہے، جو دہ بھاشا کی اصطلاحات کے متعلق کرتے تھے،

مصوری | دربار اکبری کے مصوروں میں زیادہ تر تعداد ہندو ماہرین فن کی پائی جاتی ہے، ابوالفضل نے " آئین " میں ان کے نام گنائے ہیں لیکن ان میں چار آدمیوں کو سب میں ممتاز بتایا ہے، میر سید علی تبریزی، خواجہ عبدالصمد شیریں قلم، دسونتھ، اور لبساون،

دسونتھ ایک کہار کا لڑکا تھا اس نے اپنی ساری زندگی اس فن پر صرف کر دی اس کو اپنے مشغلہ سے عشق تھا، وہ دیواروں پر نقوش بنایا کرتا تھا ایک دن اعلیٰ حضرت (اکبر) کی نگاہ اس پر پڑی، اس کی ذہانت آشکارا

---

[1] اقبال نامۂ جہانگیری، وقایع سال یاد دہم

ہوئی، اور اعلیٰ حضرت نے خود اپنے ہاتھ سے اس کو خواجہ (عبدالصمد) کے حوالہ کیا، قلیل مدت میں وہ تمام مصوروں سے بڑھ گیا اور اپنے زمانہ کا سب سے اوّل استاد ہوا آخر میں اس کو جنون لاحق ہوگیا، اس نے خودکشی کرلی، وہ اس فن کے بہت سے شاہکار چھوڑ گیا ہے بساون ایک دوسرا مصور تھا، فضائے بعید، وضع نگاری، تقسیم الوان، شبیہ طرازی، اور بہت سے شعبوں میں وہ فایق ہوا، یہاں تک کہ بہتیرے نقادان فن اس کو دسونتھ پر ترجیح دیتے ہیں ان کے علاوہ دربار اکبری میں اور تیرہ مصوّر تھے، جن میں بہ استثنائے تین سب ہندو تھے، ان کے نام یہ ہیں کیشو، مکند، مادھو، جگن، مہیش، کھیم کرن، تارا، سانولا، ہربنس، رام، ان لوگوں کے بہتیرے نقوش آج بھی موجود ہیں ای بی ہیول لکھتا ہے، کہ وکٹوریہ البرٹ میوزیم (جنوب کنسنگٹن) نے حال ہی میں "اکبرنامہ" کا ایک حصّہ حاصل کیا ہے، جس میں تقریباً ایک سو دس نقوش ہیں ان میں اکثر انھیں مصوّروں کی نگارش قلم کا نتیجہ ہیں جن کو ابوالفضل دوسرے درجہ میں رکھتا ہے، لیکن ان میں بعض وہ بھی شامل ہیں جن پر بساون کا دستخط ہے، جس کو اکبر کے مشہور ترین صناعوں میں شمار کیا جاتا ہے، [1]

ای بی ہیول نے اپنی کتاب میں اور ایک معرکۃ الآرا تصویر درج کی ہے، اس میں جہانگیر کے محل کا بائین منظر پیش کیا گیا ہے، ایک صحن ہے، اس میں مزدور کام کر رہے ہیں کوئی اینٹیں جوڑ رہا ہے، کوئی گلا وہ لئے جا رہا ہے، بہشتی پانی لا رہا ہے، بعض لوگ مسالا تیار کر رہے ہیں، دو حبشی بھی ہیں۔ ایک عصا لئے کھڑا ہے، دوسرا جھکا ہوا ہے، ایک ضعیف متبرک آدمی جو قرینہ سے شاہی خاندان کا فرد معلوم ہوتا ہے، جھکے ہوئے حبشی کے قدموں پر سر ڈالے ہوئے ہے، مؤلف مذکور کہتا ہے، کہ غالباً اورنگ زیب، محل میں شاہجہاں کو قید کر رہا ہے، اور مزدور آمد و رفت کی راہ مسدود کر رہے ہیں یہ تصویر اپنی جامعیت و تاثرات کے لحاظ سے بے نظیر ہے، اس کے نیچے "منوہر بندہ" کا دستخط ہے، ای بی ہیول اس کو "منوچہر بندہ" پڑھتے ہیں حالانکہ صاف منوہر لکھا ہوا ہے، یہ عہد اکبری کے بعد دربار مغل کا ہندو مصور تھا، چنانچہ تاثیر کہتا ہے،

بہ صنعت گرچہ آدمی بود قادر
یقیں نام منوہر بود ماہر

صاحب غیاث اللغات نے انکار کیا ہے، کہ اس نام کا کوئی نقاش ہندوستان میں نہیں گزرا لیکن یہ ہمارے لغوی کی لغویت ہے، [2]

---

[1] Indian Sculpture and painting ص ۱۹۴-۱۹۵

[2] ملاحظہ ہو حاشیہ غیاث ص ۴۵۷

اسی طرح ای بی ہیول کی کتاب میں امر سنگھ کے لڑکے سورج مل کی ایک شبیہ ہے، اس کے چاروں طرف فارسی اشعار ہیں اور سرخ و سنہری روشنائی سے باریک بیلیں بنائی ہوئی ہیں۔ یہ نقش بھی ایک ہندو مصور "نانہا" کی نگارش کا نتیجہ ہے،

موسیقی اسلامی موسیقی اور ہندوستانی موسیقی میں بنیادی اختلافات ہیں، یہ اختلاف نتیجہ ہے، قومی فرق و امتیاز، ملکی آب و ہوا، اور مقامی خصوصیات کا، چنانچہ فارسی (اسلامی) موسیقی میں بارہ پردے یا مقامات ہیں، ہندوستانی موسیقی میں سات، باینہمہ اسلامی ہند کے قبل اہل عرب ہندوستانی موسیقی سے واقف تھے، چنانچہ فرانسیسی عالم جول رووانیت لکھتا ہے،

کن لك هم لاشك عرفوا طريقة الهنود والطريقة التی یستعملها الصینیون منذ ۲۷۰۰ سنة قبل المسیح [1]

اسی طرح وہ (اہل عرب) ۲۷۰۰ ق م سے ہندوؤں کے طریقہ اور اس طرز سے جو اہل چین استعمال کرتے تھے بلاشک و شبہ واقف تھے

اسی طرح مسعودی ہندوستان کے ایک آلہ موسیقی کے متعلق لکھتا ہے،

ولهند الکیکله وهو وتر واحد یمد علیٰ قرعة فیقوم العود والصنج [2]

کیکلہ ہندوستان کا آلہ موسیقی ہے، اس میں ایک تار سرے پر لگا ہوتا تھا پس یہ بربط اور جھانج کے قائم مقام ہے

اسی کو استاد اسکندر شلفون مصر کا ماہر موسیقی "کنکلہ" لکھتا ہے، مسعودی کے بیان سے پتہ چلتا ہے کہ عرب نہ صرف ہندوستان کے آلات موسیقی سے واقف تھے، بلکہ اس نے جو لفظ "صنج" استعمال کیا ہے، وہ ہندوستانی آلہ موسیقی "جھانج" کا معرب ہے، جس طرح لفظ چین کی "چ" عربی میں "ص" سے بدل گئی، اسی طرح "جھانج" کا "جھ" "ص" سے بدل گیا، ہندوستان کا مشہور لغوی علامہ غیاث الدین بھی صنج کو جھانج کا معرب بتاتا ہے،

خلیفہ ولید اوّل کے زمانہ میں ہندوستان میں اسلامی حکومت قایم ہوئی خود خلیفہ بہت بڑا گویا اور ماہر موسیقی تھا، اس نے بہت سی راگنیاں ایجاد کیں چنانچہ جول رووانیت لکھتا ہے،

وکان الخلیفة الولید شاعراً ملحناً مولفاً فی الموسیقی له الحان کثیرة یعرف علی العود ویعرف صناعة الایقاع [3]

خلیفہ ولید شاعر اور مغنی تھا، فن موسیقی پر اس نے کتاب لکھی اسکی بہت سی راگنیاں ہیں وہ بربط نوازی اور موسیقی کے موازین سے واقف تھا،

اسی طرح ولید ابن یزید ثانی کے زمانہ میں بھی موسیقی کو بہت بڑا فروغ تھا۔ جب وہ تختِ خلافت پر بیٹھا۔ تو اس نے یونس کاتب کو طلب کیا، یہ وہی یونس ہے، جس نے ابن سریج، ابن محرز اور غریض کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اس نے راگنیوں کے متعلق ایک کتاب لکھی جو بعد میں موسیقی کی تمام کتابوں کا واحد ماخذ ہوئی۔

---

[1] دایرۃ المعارف الموسیقیہ ج ۱ ص ۷، ۳ [2] مروج الذہب [3] دائرۃ المعارف الموسیقیہ ج ۱ ص

ابوالفرج اصفہانی لکھتا ہے،

وله کتاب فی الاغانی وملحنیها کان المرجع الوحید لاهل العصر لم یسبقه الی مثله احد [1]

کانے اور راگنیوں کے متعلق اسکی ایک کتاب ہے جو اس زمانہ میں واس فن کا، واحد ماخذ تھی جسکی مثل ایک بھی نہیں ٹھیرتی،

ولید ثانی کے عہد میں بقول امیر علی موسیقی کا جنون پیدا ہو گیا تھا۔ اس لئے اندازہ ہوتا ہے، کہ ہندوستان کے ماہرین موسیقی بھی اس کے دربار میں ضرور باریاب ہوتے ہوں گے، کیونکہ اس وقت حکومت سندھ امویہ دمشق کے زیر اثر تھی،

دور امویہ کے بعد خلافت عباسی میں متبعین اسلام کو دنیا کے مختلف قوموں سے ملنے جلنے کا اتفاق ہوا اور اس لئے آرٹ کے تمام شعبوں میں مختلف عناصر شامل ہو گئے، استاد جول روو انیت لکھتا ہے

وفی حکم العباسیین اتسعت المملکة الاسلامیه وامتدت حدودها وکان ذلك عصر الابهة وانطرف العربیین علی انه کان ایضا عصر اختلاط الشعوب واحتکوا بالشعوب المقهورة فی ما بینها فاثرت تاثیرات مختلفه علی سائر الفنون [2]

عباسیہ کی حکومت میں اسلامی سلطنت وسیع ہوئی اور اس کے حدود دور دراز پھیل گئے اور یہ عربوں کی بزرگی اور شوکت کا زمانہ تھا، باوجود اس کے اس دور میں عربوں کا اختلاط ہوا اور انھوں نے مغلوب قوموں سے روایت کی پس اس وجہ سے تمام فنون پر مختلف اثرات پڑے

اس سے پتہ چلتا ہے، کہ ہندوستان کی اسلامی سلطنت کے قبل ہی سے عربی اور ہندوستانی موسیقی کا امتزاج یا اختلاط ہو چکا تھا، اس کے بعد ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں نے موسیقی سے گہری دلچسپی لی، ای بی ہیول نے اپنی کتاب میں محمد تغلق کی محفل رقص و موسیقی کی ایک تصویر اپنی کتاب میں درج کی ہے [3] بابر خود بڑا مغنی تھا، اسمٰعیل عادل شاہ کے متعلق فرشتہ لکھتا ہے،

" در علم موسیقی و شعر علم مہارت افراشتے [4] "

اسی طرح محمد علی خاں انصاری ابراہیم عادل شاہ کے متعلق لکھتے ہیں

بہ نظم و علم موسیقی آن شغف داشتہ کہ باجماعت کلاونت وصلت نمودہ اینہا را خویش و تبار خویش ساختہ [5]

ہندوستانی بادفرہشوں (بھاٹ) نے اپنے فن کے ذریعہ ہندی اور فارسی کے امتزاج سے عجیب و غریب لٹریچر چھوڑا ہے، ہندوستان کے ان مغنیوں نے بھی اردو کی تخلیق میں بڑی مدد دی ہے،

---

[1] کتاب الاغانی [2] دائرۃ المعارف الموسیقیہ ص ۵۵ [3] Indian Sculpture & Painting
[4] فرشتہ مقالہ سوم روضہ دوم [5] بحر المواج

اُردو کا وجود

صدیوں کی اسلامی حکومت، عربی و فارسی قبایل کی ہجرت، اخلاق و معاشرت کی تقلید، اختلاط، نے عربی، فارسی اور بھاشا کے امتزاج سے ایک چوتھی زبان تیار کی جسے ہندوستانی کہئے یا اُردو، لفظ اُردو بذات خود دورِ ارتقاء ہی کی پیداوار ہے، یہ نہ عربی ہے نہ فارسی، اُردو جس قوم کی زبان کا لفظ ہے، وہ اسلامی مبلغ بنکر نہیں آئی تھی، بلکہ مُلک گیری کی ہوس پیمائیوں، اور استعماری دست درازیوں نے اس کو ہندوستان میں بھیجا، اس قوم کے داخلہ کے قبل مسلمانوں کی حکومت یہاں قایم ہو چکی تھی، ظاہر ہے کہ اگر مسلمان اشاعت دین کے سلسلہ میں ہندوستان میں آباد نہ ہوتے تو بھی مغلوں کا قافلہ ہوتا اس صورت سے لفظ اُردو کا بھاشا میں داخل ہونا ضروری تھا، اس لئے نتیجہ نکلتا ہے، کہ لفظ "اردو" کشمکشِ حیات کا ایک اثر باقی ہے، لہٰذا اس کو صرف مسلمانوں کی لغات سے تعبیر کرنا صحیح نہیں،

اُردو زبان میں جب شعر و ادب کا رواج ہوا تو پھر ہندوؤں نے اسی وسعتِ دل اور فراخ حوصلگی کے ساتھ اس میں بھی حصّہ لینا شروع کیا جس طرح انھوں نے عربی اور فارسی میں حصّہ لیا تھا، ادب اُردو کی تاریخ معروف و معتبر ہندو ادیبوں کے بدیعہ افکار سے مالا مال ہے، پنڈت دیا شنکر نسیم، پنڈت رتن ناتھ سرشار، پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی (دکنی)، شفیق (دکنی)، نے اُردو کی جو خدمتیں انجام دی ہیں ان کو زمانہ اپنی فراموش کاریوں کے باوجود، صفحۂ تاریخ سے محو نہ کر سکا،

جن لوگوں نے سرشار کی "سیر کہسار" اور شفیق کی "چمنستان شعرا" کا مطالعہ کیا ہے، وہ ہندوؤں کی اُردو زباندانی اور مذاق ادب کا صحیح اندازہ لگا سکتے ہیں "چمنستان شعراء" گو فارسی زبان میں ہے۔ لیکن شعرائے ریختہ کے حالات زندگی اور نمونہ کلام پر مشتمل ہے، سیر کہسار بیگمات اودھ کی زبان کا مرقع ہے، اور اس میں طوائف زبان کے متعلق ایسی سحر کاریاں کی گئی ہیں کہ انسان پڑھنے کے بعد "بادۂ سرجوش" کے مزے لیتا ہے

کتب خانہ حیدری آرہ میں "تذکرہ شعرائے ہنود" کے نام سے ایک مطبوعہ کتاب میں نے دیکھی تھی، یہ کتاب اب پٹنہ کے ایک پروفیسر صاحب کے پاس ہے اس میں اُردو کے سینکڑوں ہندو شعراء کے حالات و کلام درج ہیں، خود میرے پاس واسوخت کا ایک مجموعہ مسمیٰ بہ "شعلۂ جوالہ" ہے، اس کا تاریخی نام "ضبط عشق" ہے، جس سے ۱۲۸۱ھ نکلتا ہے، اس میں چند ہندو شعراء کے بھی واسوخت درج ہیں۔ اور ہر شاعر کے مختصر حالات زندگی بھی ملتے ہیں،

منشی طوطا رام شایاں

شایاں کا خاندان فرمانروایان اودھ کے دربار سے وابستہ تھا شایاں کے دادا منسا رام کو بخشی الملک کا خطاب ملا تھا، منسا رام کے جدِ امجد تلسی رام کو نواب آصف الدولہ بہادر نے "رائے" کا خطاب اور زمرد کی ایک انگوٹھی عطا کی تھی جس پر یہ خطاب کندہ تھا،

پھر نواب سعادت علی خاں کے زمانہ میں آپ فوج کی بخشی گری کے عہدہ پر ممتاز ہوئے ، شاہاں سری باستب کائست تھے ،

رام سب طرح کیا دل کو بتوں نے مجھ سے ۔۔۔ راز اُلفت سے ہوئے نام خدا جب محرم
اور صورت کا نظر آیا پھر ان کا عالم ۔۔۔ پھر گئی شکل نظر دیدۂ حیراں کی قسم
طرفہ آہ دل سوزاں نے شرر باری کی ؛
دھوم دوزخ میں ہے اس آگ کی چنگاری کی

پنڈت اجودھیا ناتھ نوائی پنڈت جی دہلی کے رہنے والے اور جودھپور کی عدالت فوجداری میں ملازم تھے، آپ غالب کے ہمعصر اور ہندوستان کے مشہور شاعر مولانا امام بخش صہبائی کے شاگرد رشید تھے ، بلکہ پنڈت جی نے چھ سال کی عمر میں الف با کی ابتدا مولانا مرحوم ہی کی خدمت میں لی ، آپ کا واسوخت فارسی میں ہے ،

ای جفا پیشہ لبے نیست کہ نالان تو نیست ۔۔۔ زندۂ نیست کہ چوں مردہ بزندان تو نیست
نیست خلقے کہ تہ خنجر بُران تو نیست ۔۔۔ گردنے نیست کہ خونش تہ دامان تو نیست
زیر داماں تو خونے کہ شفق می بالد
گل خورشید بود گو زافق می بالد

لالہ منشی دھرم ہمت آپ کا وطن لکھنؤ تھا یہیں آپ پیدا ہوئے ، آپ منشی مینڈو لال متخلص بہ رآز کے شاگرد ہیں آپ کے بیان میں حد درجہ شگفتگی و حلاوت پائی جاتی ہے ، منظر نگاری میں آپ کو کمال ہے ، فرماتے ہیں

چاندنی رات ہے اور طرفہ سماں طرفہ ہی رنگ ۔۔۔ صحن گلشن میں بچھا ایک جڑاؤ ہی پلنگ
میں ہوں معشوق کو اپنے لئے آغوش میں تنگ ۔۔۔ دونوں مدہوشی میں ہیں دل کی نکلتی ہی امنگ
اس قدر کیف مے عشق میں مغرور ہوں میں
گاہ نزدیک ہوں اس بت کے کبھی دور ہوں میں

خیر یہ تو عہد قدیم کی باتیں تھیں دور حاضر میں بھی بڑے بڑے ہندو اہل قلم موجود ہیں ، مہاراجہ سر کشن پرشاد شاد، (جو راجہ ٹوڈرمل وزیر اکبر کے باقیہ صالحہ میں ہیں) پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق ، (گورکھپوری) ، منشی پریم چند ، لالہ رام سروپ شیدا بی۔ اے لکھنوی ، لالہ چندی پرشاد شیدا دہلوی ، پنڈت جگن ناتھ پرشاد آنند ، منشی پیارے لال رونق دہلوی ، لالہ دھرم پال گپتا وفا دہلوی ، لالہ چھنومل ناقد دہلوی ، شیام سندر فراق ، لالہ جگ موہن صاحب ناز،

شانتارام ایم۔اے، سردار سوہن سنگھ بی اے، مفتوں اڈیٹر ریاست، مدیر تیج مسٹر مکند بہاری لال نادم وغیرہ اس زمانہ میں اُردو کے ادیبوں میں شمار کئے جاتے ہیں، فراق گورکھپوری کی ایک نظم " ترانہ خزاں " کے عنوان سے ایوان (آہ! مرحوم) گورکھپور میں شایع ہوئی تھی اس کے متعلق زبان اُردو کے مسلمہ ادیب مجنوں گورکھپوری فرماتے ہیں،

" فراق نے جس نظر سے خزاں کو دیکھا ہے، اس نے خزاں کی ماہیت کو بدل دیا ہے، خزاں کے جو رموز فراق نے بیان کئے ہیں ان سے اُردو اور فارسی زبانیں محروم ہیں انگریزی میں البتہ شیلی، اور کیٹس کی نظمیں مجھے بے طرح یاد آرہی ہیں، حالانکہ " ترانہ خزاں " ان دونوں سے جداگانہ نوعیت رکھتی ہے " (ایوان: بابت مارچ ۱۹۳۱ء)

جناب فراق گورکھپوری کا خاندان فارسی اور اردو کی خدمات کے لئے ممتاز رہا ہے، ایوان اشاعت نے آپ کے بزرگ جناب منشی گورکھ پرشاد مخلص بہ عبرت کی ایک مثنوی " حسن فطرت " شایع کی تھی،

پیشوا کے " رسول نمبر " (بابت ۳۳ء) میں اکثر ہندو اہل قلم کی نظمیں و مقالے شایع ہوتے ہیں، ہمارے عہد میں ایک اور ہندو ادیب چمپت رائے جین ہیں، جو آجکل یورپ میں جین دھرم کی تبلیغ میں سرگرم ہیں، آپ انگریزی کے ایک مشہور مصنف ہیں، مذہبیات و فلسفہ، تاریخ و اساطیر سے آپ کو خاص شغف ہے، آپ نے انتہائی دریادلی سے کام لے کر اپنی ہزاروں روپے کی کتابیں جین سدھانت بھون (آرہ) میں وقف کردی ہیں، حال میں آپ نے " جواہرات اسلام " کے نام سے اُردو میں دو کتابیں لکھی ہیں، پہلی کتاب میں فارسی شعرا، خصوصاً رومی کے کلام سے اپنی جینی معتقدات کا موازنہ کیا ہے، اور اسلام کے صوفیانہ عناصر پر مفصل بحث کی ہے، دوسری کتاب میں اردو شعرا کے کلام کا اقتباس درج ہے، اس میں شک نہیں کہ کتاب کے اندر زبان کی بعض خامیاں ہیں لیکن عہد حاضر میں ہندو مسلمانوں کے جو تعلقات ہو رہے ہیں ان کو ملحوظ رکھتے ہوئے، جین صاحب کی یہ کتاب ملک کے لئے " الہام " کا درجہ رکھتی ہے کاش ہمارے دوسرے وطنی بھائی بھی اسی بنیاد پر قومی عمارت استوار کریں،

عبدالمالک (آروی)

دو ادبی شاہکار

شوپنہار۔ فلسفۂ شوپنہار پر ایک بےمثل تبصرہ عہ (علاوہ محصول)
مثنوی زہر عشق۔ مجلد معہ رنگین تصاویر و تین مقدمات قیمت عہ (علاوہ محصول)
مینجر نگار لکھنؤ

"زبانِ بے زبانی"

ہمارے فاضل دوست جناب اختر حسین صاحب رائے پوری نے یہ فسانہ روسی ادب جدید کے مشہور علمبردار ہیبل کے ایک افسانہ کو سامنے رکھ کر لکھا ہے جس کا عنوان "درخت کے تاثرات" ہے
اُردو میں افسانہ نویسی کا یہ انداز بالکل نئی چیز ہے اور ہمیں مسرت ہے کہ اختر حسین صاحب بڑی حد تک اس میں کامیاب ہوئے ہیں
اُمید ہے کہ ناظرین نگار جذبات و تخیل کی اس فضا کو سامنے رکھ کر اس کا مطالعہ کریں گے، جو اس رنگ کے افسانہ نگاری کی اصل رُوح ہے (اڈیٹر)

میں برگد کا ایک عمر رسیدہ درخت ہوں، غیر فانی اور ابدی!

نہ جانے کتنی مدت سے میں تن تنہا اور خاموش کھڑا ہوں۔ برقرار اور بیقرار! بے زبان اور نغمہ زن! یاد نہیں کتنی مرتبہ کڑکتی سردیوں میں اپنی بے برگ شاخوں سے کوہاسہ کی چادر کو ہٹا کر میں نے فریاد کی ہے، نہ معلوم کتنی مرتبہ آتشیں گرمیوں میں اپنی پیاسی اور حسرت بھری لاتعداد آنکھیں میں نے آسمان کی طرف اٹھائی ہیں۔ نہ معلوم کتنی مرتبہ موسم گل میں عطر بیز نسیم بہار نے میرے بے حس جسم میں سنسنی ڈال دی ہے۔ لیکن کچھ دنوں سے میں لاغر اندام ہو رہا ہوں۔ میرے چہرہ پر جھُریاں پڑ گئی ہیں۔ جسمانی تاثرات سے میں بے پروہ ہو گیا ہوں۔ میری پتیاں گر گئی ہیں۔ سردیاں اور گرمیاں دونوں میرے لئے یکساں ہیں۔ لیکن بہار! اس کے تصور میں ہی ایک ایسا جادو ہے، اس کے تخیل میں ہی ایک ایسی کشش ہے کہ میری ان بے حرکت رگوں میں نئی زندگی کی بجلی دوڑنے لگتی ہے اور ساتھ ساتھ ایک اندوہگیں پشیمانی خون کی ایک ایک بوند میں گھر کر لیتی ہے

بہار! یہ لفظ کتنا سوگوار ہے اور کتنا جان سپار۔ جب حدِ نظر تک راتوں رات لاتعداد کنول کھلجاتے تھے اور میں اپنے آپ کو پھولوں کے ایک ناپید اکنار سمندر میں کھڑا پاتا تھا تو یہ محسوس ہونے لگتا کہ جہانِ رنگ و بو میں سورج نئی شان کے ساتھ جگمگا رہا ہے۔ اس شان کے ساتھ کہ اس میں تپش نہیں صرف چاند کی حلاوت رہ گئی ہے۔ پیمانۂ دل مسرت اور احسان سے چھلکنے لگتا تھا۔ لیکن اس احسان میں اطمینان نہ ہوتا تھا۔ وہ مسرت اس روحانی سوز کو دبا نہ سکتی تھی جو تمناؤں کے ساز پر ہمیشہ

درد کے ترانے الاپا کرتا ہے۔ حسن و جمال کی اس جولانگاہ میں بڑھاپا اپنی دزدیدہ نگاہیں ڈال کر یکایک مسکرا دیتا تھا اور میرے سکون و اطمینان کو ایک کھٹک اڑا لے جاتی تھی

تخیل تمناؤں کے آغوش میں پروان چڑھتا ہے۔ جب بڑھاپے کا خیال مجھے بے چین کرتا تو میں ایک جہانِ نو کی بنا ڈالتا ——— ایسا جہان جس میں برگد کی شاخوں میں بھی پھول لگتے ہیں، رنگا رنگ کے پھول، جن سے ٹہنیاں دلہن بن جائیں ایک شاخ میں یاسمیں دوسری میں گلاب تیسری میں صنوبر ——— پستی سے لے کر بلندی تک میں گل بداماں ہوتا! آہ وہ تصور کتنا روح پرور تھا؟ لیکن عہدِ کہن کی ان داستانوں میں کیا رکھا ہے۔ اب میں بوڑھا ہو رہا ہوں اور یہ "امربیل" ——— لامحدود اور لازوال ——— مچلتی اور لچکتی ہوئی یہ "امربیل" اب مجھ پر محیط ہو چکی ہے۔ میں عظیم الشان اور پُروقار ہوں لیکن میری عظمت اور شوکت نے ہی مجھے اس چنچل "اینلی بیل" کے آگے بے بس کر دیا ہے۔ ایک دن یہ ننھی اور حقیر بیل میرے قدموں سے لپٹی رہتی تھی لیکن آج اس نے میرے جسم کو زنجیروں سے کس دیا ہے اور میری مغرور گردن کو خم کرنا چاہتی ہے

اس کی گرفت کتنی جانکاہ ہے ——— کتنی روح فرسا اور دردناک! تمنا کی طرح لادوا اور فراق کی طرح یاس انگیز، جو میرے ناتواں جسم کو پیس کر اس کی تازگی اور شگفتگی سلب کر لینا چاہتی ہے۔ اور میں ——— حرماں نصیب اور بدبخت "میں" ——— ماضی کی یاد میں اشکبار اور مستقبل سے خوف زدہ میں" ——— اس بے حقیقت بیل کی خواہش کے آگے مائل بہ خود سپردگی نظر آتا ہوں

تاہم گاہے گاہے محسوس ہوتا ہے کہ اس بیل کے مس میں کوئی مقناطیسی کشش ہے۔ جس طرح کسی باکمال کے رباب کی جھنکار خفتہ اور مُردہ راگوں کو زندہ کر دیتی ہے، جس طرح موت کی ہچکیاں بھرتے ہوئے بھی سرما بہار کی رنگینیوں سے دوچار ہو کر دم بھر کے لئے جوان ہو جاتا ہے، جس طرح کسی رہزن عقل و ہوش کے شانوں پر سر رکھ کر زاہد خود فریب کی پسلیاں پھڑکنے لگتی ہیں ——— ہاں اسی طرح میرے، تمام جسم میں، میری ٹہنیوں میں اور میری پتیوں میں، دل کی ایک ایک دھڑک اور نبض کی ایک ایک چپک میں اس کا مس ایک دلنواز بے دلی اور ایک دھندلی سی تمنا پیدا کر دیتا ہے۔ اس وقت فضا میں سوچنے لگتا ہوں کہ میری ٹہنیوں میں اتنی ہی لچک ہوتی جتنی اس "امربیل" میں ہے تو میں اس کی گرفت کو اور بھی مضبوط کر دیتا اور اس کے بوسہ کو پوری زندگی کی درازی عطا کرتا۔ لیکن الٰہی! تو نے مجھے ایسا کیوں بنایا کہ میں محبت حاصل کر سکتا ہوں واپس نہیں کر سکتا۔ دامِ عشق میں گرفتار ہو سکتا ہوں گرفتار نہیں کر سکتا۔ پریت کے گیت سمجھ سکتا ہوں گا نہیں سکتا

جب بادۂ عشق میں سرشار ہو کر جذباتِ دل کو عالم آشکار کرنے کی کوشش کرتا ہوں تو یکایک مجھے اپنی بے حسی کا احساس ہونے لگتا ہے۔ اور ارمانوں کے ہجوم پر جیسے اوس پڑ جاتی ہے۔ میری بے تابی کا صرف ایک ثبوت ہے۔

پتیوں کی خاموش جنبش ! ان کی دھیمی دھیمی سرسراہٹ سوز نہانی کی سرگم ہے۔ اُف اتنا تند و توانا ہو کر بھی ایک شرمیلی بیل کے آگے میں کتنا مجبور ہوں

بہار، نسیم، گل و بلبل، آہ و زاری ——— رنگین خوابوں کا ایک میلہ ! لیکن زندگی کی پت جھڑ میں بہار کی اُن محفلوں کو میں کیوں یاد کرتا ہوں۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے میری دنیا ان سے محروم ہو چکی۔ اب میں ایک دوسری دنیا میں رہتا ہوں جہاں غنچہ نہیں چٹختے، جہاں ارمانوں اور حسرتوں کے سوا کچھ نہیں۔ وہ بھی ایسی کہ ان میں کیف و سرور نہیں غم و غصہ کی جھلک رہ گئی ہے۔ اب بھی میرے اردگرد بہاران میں زمین گل فروش بن جاتی ہے اور ذرہ ذرہ فرطِ انبساط میں متوالا ہو جاتا ہے۔ میرا دل بھی بھر آتا ہے۔ لیکن اس میں محبت کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ دریائے حسن کے بیچ و بیچ کھڑا ہو کر بھی میں ایک لگاؤ محسوس کرتا ہوں گویا ستاروں سے مصروف گفتگو ہوں۔ جس محفل سے میں اُٹھ آیا اس میں شمول کی آرزو نہیں کرتا۔ میری تمام تر توجہات ایک دوسرے ہی جہان کی تعمیر کے لئے وقف ہوتی ہے جس کا تخیل میرے ناسوروں کو پرچاتا رہتا ہے ——— یہ بیل فنا پر حاوی اور ابد و بقا کی ندیم ہے۔ جب میں زمین کے دامن میں لیٹ جاؤں گا تو شاید وہ میرے جسم سے لپٹی رہے گی اور اس کی باقی ماندہ طاقت کو چوستی رہے گی۔ ایک وہ دن تھا جب اس کا بیج اُبھرا تھا اور میں جوان تھا۔ میرے سڈول جسم میں مسرت کی اُمنگیں موجزن تھیں اور رُوح کا ایک ایک تار فطرت کے رباب کے ساتھ غزل خواں تھا۔ میری وسیع جڑوں کے وسط میں اس کے ننھے سے بیج نے سر نکالا۔ اس کی زرد کونپلوں نے سہارے کی التجا کی اور مایوس و ناکام مُرجھانے لگیں۔ ہاں، اس وقت اسے گلے لگا کر مجھے کتنی خوشی ہوئی تھی۔ ایسی جیسے بچے کو گود میں لے کر باپ کو ہوتی ہے۔ ایک عرصہ تک اس کی باتیں دل میں یہی جذبہ پیدا کرتی رہیں۔ لیکن چشم بد دور، رفتہ رفتہ وہ ایک لمبے سانچے میں ڈھلنے لگی اور اب اسے چھونے کے بعد وہ معصومیت اور شفقت محسوس نہ ہوتی تھی۔ اس میں ایک ایسا عجیب بانکپن پیدا ہو گیا جو میری آزادی پر پھندے ڈالنے لگا۔ جب کبھی کچھ سوچنا چاہتا تو اسی کی یاد آتی گو کہ اس یاد میں حیا بھی تھی اور تمنا بھی، غرض کے ساتھ اس پر مر مٹنے کی آرزو بھی، پیاس کے ساتھ سکون تھا اور لاگ کے ساتھ ایک لگاؤ۔ آج جس جذبہ کی گہرائیوں تک میں پہونچ چکا ہوں۔ ان دنوں اس کی سطح کو بھی نہ دیکھ سکا تھا۔ اس انقلاب پر میں ہمیشہ تصویرِ حیرت بنا رہتا اور یہ حیرت بھی مسرت، نفرت، تمنا و اطمینان سے لبریز تھی۔

میرے قدموں پر ایک چھوٹا سا پتھر پڑا ہوا تھا جس پر گاؤں کی عورتیں اکثر سیندور اور چندن ملا کرتیں۔ کبھی یہ بھی ہوتا تھا کہ ان کی نازک انگلیاں مجھ پر سیندور کی ایک گہری لکیر کھینچ دیتیں۔ یہ بھی دیکھا کہ کوئی دوشیزہ بڑی سادگی سے میرے سنگین جسم کو اپنے سیمیں بازوؤں میں لپیٹ لیتی، نرم ہونٹوں سے میرے آہنی تنے کو بوسہ دیتی اور اس سنگ جبیں کو آنسوؤں سے نہلا کر چلی جاتی تھی شاید اس سے اس کے قلبِ حزیں کو کچھ قرار ہو آتا تھا

دنیا بھی ایک درخت ہے جیسے حسینانِ عالم اس بیل کی صورت دامِ بلا میں گرفتار کئے ہوئے ہیں۔ لیکن مجھ پر

ان کے ناز و نیاز کا مطلق اثر نہ ہوتا تھا۔ ہاں جب کوئی بدبخت میرے دامن کو تھام کر آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی آوازیں کہتی " دیوتا میری مُراد کب بر آئے گی " تو میں بھی پسیج جاتا اور اپنے پتوں کو ہلا کر کچھ کہنا چاہتا۔ لیکن خبر نہیں کہ میرے اشاروں کو وہ سمجھتی تھی یا نہیں۔ میں سوچتا رہ جاتا کہ کاش بے گل و ثمر برگد نہ ہو کر میں پھولوں کا ایک پودا ہوتا۔ کم از کم اپنی ہمدردی کا اظہار تو کر سکتا۔ جب حُسن کی وہ مورت مجھے چھوتی تو مُرجھائے ہوئے پھول پھر کھل جاتے۔ اور اس کے قدموں پر اشکبار برس کر گویا میرا پیغام پہونچا دیتے ——— لیکن دل ہی دل میں یہ منصوبہ باندھتا رہ جاتا اور وہ چلی جاتی

تاہم ، ان کی قرابت میرے جسم میں تھرتھری پیدا نہ کر سکتی تھی۔ میں از سر تا پا کانپنے نہ لگتا تھا۔ لیکن کبھی جب کوئی دوشیزہ میری نازک اندام بے زبان بیل کی کوپلوں کو توڑ کر مجھ پر بکھیر دیتی تو میرے دل پر چوٹ لگتی تھی۔ لیکن جتنا غم و غصہ ہوتا اسے ظاہر نہ کر سکتا تھا۔ جمال باری سے دل ہی دل میں مَیں فریاد کرتا اس اُمید پر کہ وہ رُخ کی آواز کو پہچانتا ہے " یارب اس عورت کو بھی اتنا ہی کرب و الم نصیب ہو " وہ بیچاری مجھے دیوتا مانکر پھولوں کی نذر چڑھاتی اور اسے میں بد دعا دیتا۔ محبت کے نشہ میں مَیں مدہوش تھا۔ حتیٰ کہ عقل و خرد سے بھی واسطہ نہ رہا تھا۔ کتنی عجیب و غریب تھی وہ محبت ؟ کاشکہ میں جانتا ہوتا ! کاشکہ میں جانتا ہوتا !!

لیکن کیا سب کچھ سمجھنے کے باوجود میں اس دام میں گرفتار نہ ہوتا ؟ گو کہ یہ بیل آج میرے جسم کے ایک ایک بند پر حاوی ہو چکی ہے تاہم اس کا مس میرے لئے کتنا ولولہ انگیز ہے۔ محبت آئینہ کی طرح شفاف ہوتی ہے۔ ہر آدمی اس میں اپنا عکس رُخ دیکھتا ہے اور ایک بار چور چور ہو جانے کے بعد یہ آئینہ کبھی ثابت نہیں ہوتا۔ ممکن ہے کہ متواتر کوشش کے بعد اس کے ٹکڑوں میں یکجائی ہو جائے لیکن وہ صفائی کہاں سے آئے گی ؟ آئینہ میں ہمیشہ کے لئے بال پڑ جاتا ہے۔ عشق وار پہ وار سہتا ہے ، پیہم ناکامیوں کے بعد بھی اُف نہیں کرتا۔ لیکن وہ کمال درجہ خود دار اور غیور ہوتا ہے۔ صرف ایک جھڑکی اس کی شمع زندگی کو گل کرنے کے لئے کافی ہے۔ آج یہ بیل میری زندگی میں اتنا دخل حاصل کر چکی ہے۔ لیکن اس کشمکش میں عشق کا جزو بھی نہیں۔ یہ بیکلی عشق کی پرتو نہیں بلکہ اس کی یادگار ہے اور بس

داستان محبت کی جب ورق گردانی کرتا ہوں تو دل میں ٹیس سی اٹھتی ہے۔ محبت سے جو اُمیدیں وابستہ تھیں وہ سب تشنۂ تکمیل رہیں اور اس کا سزاوار میں ہرگز نہیں۔ محسوس ہوتا ہے کہ خدا نے مجھے ، اس " امر بیل " سے اور مجھے دیوتا سمجھنے والی ان اطہر نما دانوں سے انصاف نہیں کیا۔ بے گناہ ہوتے ہوئے بھی ہم اپنے کسی حق سے ——— ایسا حق جو ناقابل بیان ہے ——— محروم کر دئے گئے۔ جب یہ خود فریبی چٹکیاں لینے لگتی ہے تو آرزو ہوتی ہے کہ کاش میں درخت نہ ہوتا انسان ہوتا۔ ایک دائرہ میں زندگی محدود نہ ہوتی ، اپنی پھیلائیں

کوتا کہتے تا کہتے میں یوں بوڑھا نہ ہو جاتا۔ میری زندگی بھی رواں، دواں، اور جوان ہوتی تا کہ محبت کا اظہار کر سکتا اور —— اس طرح بے زبان و بیقرار نہ ہوتا!

لیکن کیا قلب انسانی میرے جذبات کا احساس نہیں کر سکتا؟ کیا انسان کی محبت اتنی مختلف ہے؟ کیا اس کی فریاد کی کوئی لے ہے؟ کیا اس کے نالوں میں کوئی نے ہے؟ کیا میرے جذبات کی ترجمانی کے لئے وہ گہری سانس کافی نہیں جو طوفان کی آمد کا پتہ دیتی ہے؟ کیا انسانوں کی دنیا میں بھی محبت کا پھول اندھیرے میں کھلتا اور مرجھاتا نہیں ہے؟ کیا ان میں بھی محبت کی انتہا یہ نہیں ہے کہ گفتگو کے لئے الفاظ ناکافی ہوں اور صرف سانسوں کا آتار چڑھاؤ جان معنی میں ارتعاش پیدا کر سکے؟ کیا ان میں بھی تمنا کے بعد پشیمانی اور فریاد کے بعد شرمساری پیدا نہیں ہوتی؟ ندی کی طرح انسان ہمیشہ گردش میں ہے اور ہم پہاڑ کی طرح اچل ہیں۔ لیکن ہم اس سے کہیں زیادہ عمر دراز اور مستقل ہیں۔ انسان کی محبت ایک شمع ہے جو بجھنے کے لئے روشن ہوتی ہے۔ ہماری محبت کی مثال جگنو سے دی جا سکتی ہے جو تا عمر جلتا ہے اور بعد از مرگ بھی روشن رہتا ہے

ایک زمانہ گذرا۔ ان دنوں مجھے اس "امربیل" کی ناز برداری سے فرصت نہ تھی۔ اوّل اوّل اس کے بوسوں میں مجھے ایک لذت محسوس ہونے لگی تھی۔ اور اس نئے جذبہ کے اسباب و اثرات معلوم کرنے میں میں اتنا محو تھا کہ گرد و پیش سے قطعاً بے نیاز ہو گیا تھا بھولے بھٹکے اپنے ماحول پر ایک آدھ نگاہ غلط انداز ڈال دیا کرتا تھا۔ میں جس واقعہ کا ذکر کر رہا ہوں وہ روز پیش آتا تھا اور اس سے باخبر ہوتے ہوئے بھی میں بے خبر تھا۔ تاہم نادانستہ طور پر یہ حادثہ مجھ پر ایسا گہرا نقش چھوڑ گیا کہ اسے میں آج تک نہ بھول سکا

جو بُت میری قدم بوسی کر رہا تھا، اس کی پوجا کے لئے صدہا عورتیں آتی تھیں۔ روز کوئی پرانی پجارن غائب ہو جاتی اور اس کی جگہ لینے کے لئے کوئی نئی حسن کی دیوی آجاتی تھی۔ یہ نئی نویلی شرم کے بار سے دبی جاتی تھی۔ نرگسی آنکھیں زمین میں گڑی جاتی تھیں اور رُخِ پر نور تار نقاب کے اندر بھی عرق عرق ہو جاتا تھا —— مجھے بے جان سمجھ کر وہ کبھی میرے جسم کا سہارا لیتی اور کبھی اپنے ناخونوں سے میرے تنے کو کرید اکرتی۔ میرا دل تیزی سے دھڑکتا اور میں گہری سانس کھینچ کر خاموش ہو جاتا کہ مبادا وہ سہم نہ جائیں۔ ایک لمحہ کے بعد نقاب ان کے رُخ روشن کا پردہ دار بن جاتا، پھولوں کے ہار ان کے بیدار جذبات کو تھپکیاں دیتے اور چھاگل کے گھونگرو ان پیروں کو چوم کر رقص کرنے لگتے تھے

ان مہوشوں میں سے ایک کا وتیرہ سب سے جدا تھا۔ نگاہیں سمیٹے سب سے چھپکر وہ میرے پاس آتی اور سر جھکا کر فوراً چلی جاتی تھی —— اس خوف سے کہ کوئی اسے دیکھ نہ لے۔ زیبائش سے وہ اتنا ہی دور تھی جتنا کہ چاند۔ نہ اسکی

جبیں پر "کم کم" ہوتا نہ پیروں میں چھاگل - اس کی سادگی سفید ساری سے یوں چھن چھن کر نکلتی تھی جیسے بنت البحر نے نہنگ آسا موجوں سے سر نکالا ہو یا دوشیزۂ صبح سفید بادلوں میں تیر رہی ہو - اس کی آمد کا کوئی وقت مقرر نہ تھا - کبھی وہ صبح میں آتی کبھی دوپہر میں اور کبھی دونوں وقت ملے - جب وہ شام کو آتی تو اسی "امربیل" کو تھام کر میری گھنی چھاؤں میں بیٹھ جاتی جب تک سورج شب کے محل میں آرام کرنے نہ چلا جاتا وہ اپنی پُرحسرت نگاہوں سے اس مغزل ناتمام کو تاکا کرتی - لہرائی ہوئی پگڈنڈی کی خاک شفق کے پرتو سے لالہ گوں بن جاتی جیسے خونِ تمنائی سرخی ابھر آئی ہو

ماضی ناکامیوں کا آماجگاہ اور مستقبل امیدوں کا آئینہ ہے - ماضی افسردگی کے قلم سے اس کے چہرہ پر ناکام آرزوؤں کے افسانے لکھا کرتا - جب اس کے سینہ سے گہری سانسیں نکلتیں تو میرے پتے بھی ضبط نہ کر سکتے اور پیہم چیخ اٹھتے تھے - کبھی اس کی زبان سے ایک لفظ نہ نکلا اور نہ اس نے کوئی دعا مانگی - ہاں گاہے گاہے وہیں بیٹھ کر وہ کچھ گن گناتی ضرور تھی لیکن ان نغموں کو میں نہ سمجھ سکتا تھا

پہلے تو میری توجہ اس کی طرف منعطف ہی نہیں ہوئی لیکن شام کے سناٹے میں جب وہ عموماً ادھر گذرنے لگی تو میری دلچسپی بھی رفتہ رفتہ بڑھتی گئی - سورج کے ڈھلتے ہی میں بے تابی سے اس کا انتظار کرنے لگتا اور اس کے آنے میں جتنی تاخیر ہوتی ہولِ دل اتنا ہی بڑھتا جاتا - مجھے یاد ہے کہ خلاف معمول ایک روز وہ نہ آئی تو میں دیر تک اس کا انتظار کرتا رہا - دامن مغرب میں سورج نے منہ چھپا لیا، لیلائے شب نے نقاب سے سر نکالا، ستاروں کی انجمن منعقد ہوئی چاند کی کرنوں نے اپنا ساز چھیڑا، کہکشاں نے آسمان پر بجلیاں بکھیر دیں ——— پھر بھی وہ نہ آئی !

دو دن، تین دن، سیکڑوں ہزاروں دن آئے اور چلے گئے لیکن وہ نہ آئی یہاں تک کہ میں نے اس کے انتظار سے منہ موڑا اور اپنے منتشر جذبات کا مخزن اسی باوفا "امربیل" کو بنانے کی کوشش کرنے لگا

میں اسے بھول چکا تھا کہ ایک روز وہ آگئی ——— ایک ہیبت ناک خواب کی طرح - وہ دن بھی مجھے یاد رہیگا گھنگھور بادل چھائے ہوئے تھے - غضب کی سردی تھی - باد تند کے جھکولے کھا کھا کر "امربیل" تھرتھرا رہی تھی - میں سوچ رہا تھا کہ اسے اپنے کس پہلو میں جگہ دوں - یکایک دیکھا کہ اسی خاک آلود راستہ پر وہ تیزی سے چلی آرہی ہے - لیکن وہ بدل چکی تھی - وہ جمال جہاں آرا بوئے گل کی طرح غائب ہو چکا تھا - چہرہ پر اتنی جھریاں تھیں گویا عمر رفتہ نے اپنی آستینوں کو چنا ہو آنکھوں میں حلقہ پڑ گئے تھے - ہونٹ سوکھ کر لٹک گئے تھے - جب میں نے دونوں تصویروں کا مقابلہ کیا تو وحشت سی ہونے لگی

الٰہی ! حسن کو فنا ہے تو عشق کو لازوال کیوں بنایا ؟ قریب آکر نہ اسنے ہاتھ باندھے نہ سر جھکایا اور نہ اس بیل کا سہارا لیا - ایک مرتبہ چاروں طرف دیکھ کر وہ مجھ سے لپٹ پڑی اور زار زار رونے لگی - آہ ! میں اس کے گیت سننے کا آرزومند تھا - آنسوؤں کی زبان کو میں کیا سمجھ سکتا

میں نے دیکھا کہ وہ صرف ایک ساری باندھے ہوئے ہے۔ جو جگہ جگہ سے شکستہ ہو چکی تھی۔ بال بکھرے ہوئے پیر خون میں رنگے ہوئے، ماجسم نازنیں خاک آلودہ، روتے روتے وہ کہنے لگی "دیوتا! سب نے مجھے ٹھکرا دیا۔ انسانوں کے رحم و کرم سے میں محروم ہو چکی۔ میں نے بیوفائی کی، احسان فراموشی کی ——— کس اُمید پر؟ محبت نے میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی۔ محبت؟ فریب، مکر، دھوکا! اس ظالم نے مجھے دین و دنیا کہیں کا نہ رکھا۔ مہذب دنیا اب مجھے عصمت فروش ہرجائی کے نام سے پکارتی ہے۔ دیوتا! کیا تم مجھے اپنے دامن عاطفت میں جگہ دو گے۔ جانتے ہو، اپنے کاندھوں پر کیسے گناہ عظیم کا بار لئے آئی ہوں؟ میں ایک ایسے بچہ کی ماں ہوں جس کا باپ بننے کے لئے کوئی مرد طیار نہیں۔ دیوتا! کیا تم میرے گناہوں کو درگذر کرو گے"۔

اس کی فریاد میرے لئے ناقابل برداشت تھی۔ میں سوچنے لگا کہ اپنی ہمدردی کا اظہار کس طرح کروں۔ کاشکہ شبنم کے کچھ قطرے ہی ٹپک پڑتے جن پر اُسے میرے آنسوؤں کا گمان ہو جاتا

نقاہت کی وجہ سے اس کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی ہونے لگی اور وہ بیہوش ہو کر گر پڑی۔ کئی گھنٹے گذر گئے اور وہ اسی حال میں پڑی رہی۔ بعدازاں اس کا جسم یکبارگی لرزا اور پھر اینٹھنے لگا۔ وہ خواب میں بڑبڑانے لگی "کیا عورتوں کو بھی دراصل خدا نے ہی پیدا کیا تھا؟ اور اس بچہ کو؟ ——— اس بچہ کی پیدائش کا ذمہ دار کون ہے؟ خیر میں سہی لیکن میرے گناہوں کا خمیازہ وہ کیوں اٹھائے گا۔ خدا رحیم و کریم ہے ——— شائد مردوں کے لئے لیکن عورتوں کا خدا کہاں ہے؟ ——— خدا، جنت، روح، دنیا، عاقبت، سب مردوں کے لئے ——— آہ میرا بچہ! میرا بچہ!!"

آسماں پر ستاروں کو نیند آنے لگی۔ مشرق میں صرف ایک ستارہ جگمگا تا رہ گیا۔ نسیم صبح کی خنکی تیز تر ہو گئی۔ شب کی سیاہی اور بھی گہری ہو گئی۔ اسی عالم سکون میں یکایک ایک روح فرسا چیخ اس کے سینہ سے نکلی۔ اور وہ تڑپ کر اُٹھ بیٹھی۔ اس نے اپنی پھٹی ہوئی ساری کو تار تار کر ڈالا اور پھر گر پڑی۔ ایک ہچکی اور ایک چیخ ——— کتاب زندگی کی یہ تفسیر تھی وہ مر چکی تھی

جب سورج کی روشنی پھیلی تو میں نے دیکھا کہ وہ میرے سامنے برہنہ پڑی ہے۔ اس کا جسم زرد ہو گیا تھا، ناخن نیلے پڑ گئے تھے، بازو میں پھٹی ہوئی ساری پڑی تھی جس پر ایک بچہ کی خون آلود لاش رکھی ہوئی تھی۔ برسات کے پانی میں یہ خون دور تک بہہ نکلا تھا، اور آس پاس کی مٹی پر ایک سُرخ تہہ پڑ گئی تھی

جذبۂ محبت کی یہ مثال تھی جس کی حقانیت اور عظمت کے متعلق انسان عجیب و غریب باتیں کہا کرتا ہے۔ ممکن ہے کہ میرا قیاس غلط ہو، ممکن ہے کہ محبت کے غلط مشاہدات نے میرے تخیل کو بھی ناقص بنا دیا ہو۔ کیا یہ دو پایہ جو اپنے آپ کو انسان کہتا ہے اتنا شقی القلب اور سیاہ باطن ہو سکتا ہے؟ اس خیال سے میں اپنے آپ کو بازر کھنا چاہتا ہوں لیکن جب یاد کرتا ہوں کہ میری جڑیں ان دو بے گناہوں کے خون سے سینچی گئی ہیں جنھیں انسانیت نے محبت کی قربانگاہ پر بھینٹ چڑھایا تھا تو میں حیوانیت کو اس پر فوقیت دیتا ہوں اور اپنی قسمت کو سراہتا ہوں کہ انسان نہ ہوا۔ وہ دونوں

بے گناہ محبت پر قربان ہوئے یا سوسائٹی کے رواج پر یا مرد کی خواہشات نفسانی پر؟ وہ عورت بے گناہ تھی۔ وہ محبت کرنا چاہتی تھی لیکن اسے دھوکا ہوا۔ وہ مرد کی ناپاک ہوس رانی کی شکار ہوئی لیکن جب اس کی محبت پاک تھی تو اُسے مجرم کیوں قرار دیا گیا؟ وہ خود نفس پرست نہ تھی۔ اس ظالم سوسائٹی کو اس معصوم بچہ نے کیا نقصان پہونچایا تھا؟

انسان دراصل کس سے محبت کرتا ہے ——— اپنی خودی سے یا معشوق سے؟ اپنے پسندیدہ جذبات اور توہمات کی مجسمہ صورت سے محبت کرتا ہے یا محبت پر اپنی خودی کو فنا کر دیتا ہے معلوم نہیں! جو بھی ہو، انسانیت کے دعوی محبت کی حقیقت خون کی وہ بوندیں ہیں جن کی آڑ میں درندگی مسکرا رہی ہے

کبھی کبھی شام کو جب پرندے اپنے آشیانوں میں پر سمیٹ لیتے اور اندھیرے کے خوف سے فطرت ایک گہری سانس کھینچ کر خاموش ہو جاتی تو عالم تنہائی میں یکایک مجھے محسوس ہوتا کہ میری زندگی ——— اتنی طولانی زندگی یونہی برباد ہو رہی ہے ——— اس امر بیل کی گرفت میں عجیب لطیف درد پنہاں ہے۔ ایک درد ہے میٹھا میٹھا، ایک ٹیس ہے دلنواز، اس احساس کو مٹانے کی میں لاکھ کوشش کرتا ہوں مگر بے سود۔ بربادی کا یہ احساس، زندگی کی یہ تمنا، کسی تصور پر مر مٹنے کی یہ آرزو، کسی دوسرے خیال کو دلنشین ہونے کی اجازت ہی نہیں دیتی۔ میں چاہتا ہوں اپنی ہستی کو قدرت کی لامحدودیت میں گم کر دوں، کبھی نہ سوچوں کہ زندگی لاحاصل اور بے معنی ہے، ایک مرتبہ از سر نو شباب پرور اور تازہ دم ہو جاؤں۔ مگر کجا پیرانہ سال برگد کا ایک "ٹھونٹھ" اور کجا قدرت کا اٹل قانون! میں بولنا چاہتا ہوں لیکن زبان سے محروم ہوں، چلنا چاہتا ہوں لیکن پیر نہیں۔ آہ! میں رونا چاہتا ہوں لیکن آنکھیں کہاں سے لاؤں میں چاہتا ہوں کسی سے محبت کروں، ایسی محبت جو ہمیشہ حیات تازہ بخشے اور کبھی نہ مرجھائے۔ لیکن میرا جمود مجھے تسلیم و نیاز سے روک لیتا ہے اور عشق کی بارگاہ پر جبیں سائی کا موقع نہیں دیتا۔ یا تو میں اظہار محبت سے ہی قاصر ہوں اور یا شرم لبوں پر مُہر سکوت لگا دیتی ہے

میرے ذہن میں کسی کی یاد کا دھندلا سا خیال رہ گیا ہے۔ لیکن وہ یاد واضح نہیں ہے۔ صرف ایک نقش ہے وہ بھی ناکام آرزوؤں کی راکھ میں دبا ہوا۔ جس طرح کہر میں شمع روشن نظر نہیں آتی لیکن اس کی کرنوں میں جگمگاتی ہوئی شبنم کی بوندیں دکھلائی پڑتی ہیں اسی طرح وہ یاد بذات خود پس پردہ ہے اس کا ایک نقش باقی ہے۔ اتنا تو معلوم ہے کہ میری محبت کی ہمہ گیری اور وسعت سے اسکا تعلق ہے لیکن تعلق کیا تھا یہ یاد نہیں آتا

ایک دوسرا واقعہ یاد آتا ہے جس نے کسی زمانہ میں میرے دل کی دنیا کو منور کر دیا تھا لیکن وہ روشنی گویا بجلی کی تھی جس نے میری آنکھوں کو ایک عرصہ کے لئے خیرہ کر دیا

میرے قریب ان دونوں لاشوں کے برآمد ہونے کے بعد شائد لوگ مجھ سے ڈر گئے تھے۔ اب نہ وہ بت شرمندہ پرستش ہوتا اور نہ میرا چبوترہ سجدہ گاہ قرار پاتا۔ بھولے بھٹکے اگر شام کو کوئی راہ گیر ادھر سے گذرتا تو سہمی ہوئی نظروں

سے دائیں بائیں دیکھ کر میرے سایہ سے بچتے ہوئے تیزی سے نکل جاتا۔ دن میں کچھ گستاخ لڑکے دور کھڑے ہو کر میری طرف پتھر پھینکتے اور بھوت بھوت کا شور مچایا کرتے۔ ان کا مطلب میں صاف صاف تو نہیں سمجھ سکتا تھا۔ لیکن ان کے اطوار میں حقارت اور نفرت کے آثار دیکھ کر مجھے دلی صدمہ ہوتا تھا۔ کیا انسان کی عبادت بھی اتنی ہی بادر ہوا ہے جتنی اس کی محبت ؟ زیادہ عرصہ نہیں گذرا جب میں ایک زمانہ کا سجدہ گاہ بنا ہوا تھا۔ میرا سنگ آستاں اس گاؤں کا سنگِ جبیں بنا ہوا تھا۔ حسینانِ عالم بصد شوق میرے آگے سر جھکا کر اپنے دکھ درد کا مداوا مانگتے تھے گویا میں ان سب لوگوں کا تنہا مشکل کشا تھا۔ حالانکہ میں ان کے آلام کا سدباب نہ کر سکتا تھا۔ تاہم اپنی خاموش زبان سے میں ان کی غمگساری تو کرتا تھا۔ میں بے حس اور بے زبان تھا لیکن اس سے میری توقیر پر کوئی اثر نہ پڑتا تھا۔ لیکن مقام حیرت ہے کہ جیسے ہی اس دکھیاری نے میرے پاس آکر اپنی مصیبتوں کا خاتمہ کر لیا تو گویا میری ساری وقعت بھی اس کے خون میں دھل گئی۔ کیا ان تمناؤں اور دعاؤں میں صداقت کی ذرا بھی بو نہ تھی ؟ اس روز پتہ چلا کہ انسانیت کو دراصل کون سا مرض لاحق ہو گیا ہے۔ لیکن اس احساس نے بھی مجھے نجس اور ناپاک بنا دیا ہے جب میں درد کے احساس سے نابلد تھا تو کتنے مریض آتے تھے۔ اب جو میں اس عالمگیر مرض کا علاج معلوم کر چکا ہوں تو کوئی میرے قریب بھی نہیں آتا اور اس طرح یہ احساس میرے لئے جان لیوا ہو گیا ہے ! عبادت اور محبت میں کوئی تعلق ہے یا نہیں ؟ محبت ..... روشنی ہے، عبادت تاریکی میں روشنی کی جستجو ہے محبت اُمید ہے، عبادت نا اُمیدی میں اُمید کی تلاش ہے محبت دریا کی پُرسکون روانی ہے، عبادت تلاطم خیز سمندر میں ساحل کی تلاش ہے۔ میں محبت کو سمجھ سکتا ہوں کہ وہ زندگی ہے۔ میں عبادت کو نہیں سمجھنا چاہتا کہ وہ موت کا گیت ہے

'خزاں یہ کہتی تھی میں شوخیٔ بہاراں ہوں'

رفتہ رفتہ جنون وحشت کا یہ دَور گذر گیا اور میں از سر نو جوان ہونے لگا۔ میری کونپلیں ہری ہونے لگیں اور شاخوں میں شباب کی کج ادائی آنے لگی۔ میرے برگشتہ جذبات میں امید نے نئی تازگی پیدا کر دی۔ معلوم ہوتا تھا کہ دنیا کا ہر برگ و شجر امید کے ترانے الاپ رہا ہے اور زمین سے آسمان تلک ہر شے موسیقیت کے نشہ میں متوالی ہو گئی ہے۔

شہرت کی زندگی طویل نہیں، وہ نیک نامی پر محمول ہو یا بدنامی پر۔ اس روز میں نے اپنی توقیر کو خاک میں ملتے دیکھا تھا آج یہ کلنگ کا ٹیکہ بھی مٹ گیا۔ عزت کا ستون ایک لمحہ میں مسمار ہو گیا تھا دوبارہ اس کی تعمیر میں کئی سال لگ گئے بارے آج وہ پھر کھڑا ہو گیا۔ اب راہ گیروں اور سیلانیوں کے غول بے خوف و خطر میرے قریب آنے لگے۔ گو کہ وہ میری پوجا نہ کرتے تھے ایک نگاہ غلط انداز ڈال کر لاپرواہی سے میرے سایہ تلے بیٹھ جاتے تھے گاؤں کی عورتیں بھی میرے پاس بیٹھنے لگیں گو کہ وہ میری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتی تھیں۔ یا تو یہ تغافل تھا یا غرور حسن بہر کیف میں خوش ہوتا تھا کہ پسماندگی میں اپنے سایہ کی ٹھنڈک سے انھیں کچھ دیر سکون تو پہونچا سکا۔ اور

تو اور ننھی لڑکیاں بھی میرے اردگرد ناچنے لگیں ان کے دل میں نہ عزت تھی نہ حقارت ان کے لئے زندگی ایک رقص شرر تھی اور بس! آہ میرے ٹوٹے ہوئے مندر کی تعمیر ازسرنو ہوئی تھی لیکن یہ وہ مندر تھا جس سے مورت غائب ہو گئی ہو اور لوگ اس سے سرائے کا کام لینے لگے ہوں

قسمت نے پھر پلٹا کھایا، جب مشرق کی وادیوں سے دوشیزہ صبح آنکھیں ملتے نکلتی تو میری بلندیاں کوئل اور پپیہوں کے ساتھ غزل خواں ہو جاتیں۔ نسیم صبح کی جمال آرائیوں کو دیکھ کر میرے پتے فرط انبساط میں لرزنے لگتے۔ کنول کے پھولوں کی خوشبو ہواؤں کو مستانہ بنا دیتی۔ جب ساری دنیا بہ یک وقت تمام تر رنگینیوں کی جلوہ گاہ بن جاتی تو "وہ" آتی اور ان کھیتوں میں دیر تک چہل قدمی کرتی جن میں نیند کی ماتی کلیاں جاگنے کی کوشش کیا کرتی تھیں جب آفتاب کی گستاخ کرنوں کے بوسے اس کے رخساروں کو لالہ زار بنا دیتے اور اس کے لب پر پسینہ کی بوندیں شبنم کے قطروں سے چشمک زنی کرنے لگتیں تو وہ مسکراتی ہوئی میرے سامنے آکھڑی ہوتی۔ اس کی سج دھج بھی نرالی تھی اب تک میں نے کسی حسین میں یہ انداز نہ دیکھے تھے۔ یا تو اس کا لباس آسمانی ہوتا یا نرگسی اور ناگن لٹیں ہمیشہ لہراتی رہتیں۔ اور اللہ رے دیدہ دلیری! اس کی نگاہیں کبھی نگوں نہ ہوتیں ہمیشہ سامنے کی طرف تاکتیں۔ ان میں جھجھک کا نام نہ تھا ان میں ایک برق تجلی پنہاں تھی جو دیدار عام کی دعوت دے رہی تھی۔ شوخی اور جادو کی لاانتہا بجلیاں جو کیف آور پلکوں کے نیچے چھپی ہوئی تھیں گویا وہ عشق کی دنیا سے پوچھ رہی تھی کہ اگر تیری پابندیوں کو توڑ دوں تو کیا ہو

جب وہ میرے پاس بیٹھ جاتی تو اس کے چہرہ کی جولانی اور تابانی کو دیکھ کر معلوم ہوتا کہ اس کا دل خوشی سے لبریز ہے میں سوچنے لگتا کہ ایسی کونسی بات ہو سکتی ہے جس کا تصور اتنا خوش کن اور جاں نواز ہو اکثر وہ ادھر آتی اور گھنٹوں عالم تخیل میں مسرت کے طلسم گڑھا کرتی اور مجھے کبھی اس خوشی کا راز نہ معلوم ہوتا

لیکن یہ عقدہ کب تک حل نہ ہوتا۔ حیف جس چھوٹے دیوتا کی عبادت میں میں نے عمر گذار دی تھی یہ فریب خوردہ بھی اس کی ہی پجارن تھی۔ دریائے محبت میں اس نے بھی زندگی کی ناؤ ڈال دی تھی کیا درحقیقت اسے ساحل کا پتہ مل گیا تھا کیا وہ تمناؤں اور حسرتوں کے بھنور سے نکل چکی تھی اب میں ان ہی گورکھ دھندوں کے سلجھانے کی کوشش کرنے لگا

ایک روز اسی راستہ سے میں نے ایک نوجوان کو آتے دیکھا، اب تک یاد ہے ہاں خوب یاد ہے ——— اس نے پجارن کی آنکھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیے تھے اور وہ مسکرائی تھی ——— آہ وہ مسکراہٹ!

ان دونوں کی ملاقات سے مجھے ایک دلچسپ تجربہ ہوا جسے یاد کر کے اس بڑھاپے میں بھی میں ہنسا کرتا ہوں۔ انسان بلائے عشق میں مبتلا ہونے کے بعد اپنا انداز تکلم بھی بھول جاتا ہے۔ وہ شاعری اور موسیقی کی دنیا میں بھٹکا کرتا ہے پہلے آنکھوں ہی آنکھوں میں باتیں ہوتی ہیں جنھیں تم بے جان نہیں سمجھ سکتے۔ آنکھیں اٹھتی ہیں جھپکتی ہیں اور جھک جاتی ہیں۔ کاشکہ میں جانتا ہوتا! کاشکہ میں جانتا ہوتا!

ایک عرصہ تک حجاب اور نظارہ کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ کبھی نوجوان پہلے آتا۔ اور زیر لب کچھ گنگنایا کرتا۔ گو میں اس کی آواز نہ سن سکتا تھا لیکن اس کی خود فراموشی کا اندازہ لگا سکتا تھا۔ جب وہ پہلے آتی تو کھیتوں میں ٹہلنے لگتی اور کبھی کبھی اوس سے بھیگا ہوا ایک آدھ تنکا اٹھا کر اپنے دانتوں۔ کچلا کر بدنے لگتی

اب تک مجھے وہ دن یاد ہے۔ وہ نور کے تڑکے آئی اور دوپہر تک بیٹھی رہی جب میں اس کے اضطراب کا تصور کرتا ہوں، اس خلش اور تپش کو یاد کرتا ہوں تو دل میں ایک کھٹک سی ہوتی ہے۔ عشق اپنا خراج مانگتا تھا آنسوؤں کی صورت میں اور غرور و تمکنت کی ضد تھی کہ ان کی بات رہے۔ آنکھوں میں بار بار آنسو ڈبڈبا آتے تھے لیکن سوکھ کر وہیں رہ جاتے تھے تھک کر میرے گھنے سایہ میں اس "امر بیل" کو لپیٹ کر وہ بیٹھ گئی دوپہر تک وہ بیٹھی رہی —— لیکن وہ نہ آیا

آہستہ آہستہ اس کی پریشانی دور ہو گئی۔ اب انتظار تھا اضطراب کا نام نہ تھا۔ انجام کار وہ اٹھی اور چلی گئی جاتے جاتے وہ کہنے لگی —— مجھ سے یا اس "امر بیل" سے، اپنے آپ سے یا کسی نامعلوم آدمی سے کہہ نہیں سکتا۔ وہ کہنے لگی "ٹھیک ہوا۔ اس محبت کا انجام بھی یہی ہونا تھا۔ اگر فرض منصبی کو بھول کر راحت کی جستجو ہی محبت کا ماحصل ہوتا تو کیا ہوتا؟ میں اپنے جذبات اور احساسات کو ظاہر نہ کر سکی لیکن اس سے کیا؟ میرے دل میں جو کچھ تھا اور ہے۔ اس سے میری زندگی روشن ہو گئی۔ محبت مجموعہ ہے رنج و راحت کا، ہجر و وصال کا، اضطراب و مسرت کا۔ محبت ضدین کی گود میں پھولتی پھلتی ہے ورنہ محبت کتنی بے معنی اور بے لطف ہو جاتی" وہ اٹھی اور چلی گئی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے میری زندگی کے دائرہ سے اوجھل ہو گئی لیکن اس کی خود فراموشی کو میں عمر بھر نہ بھولوں گا

اس داستانِ غم کے ساتھ میری رام کہانی بھی ختم ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ محبت انسانی کے میرے مشاہدات بھی ختم ہو گئے۔ سالہا سال جس سراب صحرا کی جستجو میں میں سرگرداں تھا اس کا جواب مجھے ایک سوال کی صورت میں ملا "ورنہ ہماری محبت کتنی بے معنی اور بے کیف ہوتی" جس حقیقت کو میں ہنوز نہ سمجھ سکا تھا۔ ایک عورت نے ایک لمحہ میں اس کا پتہ دے دیا۔ اس وقت میری سمجھ میں آیا کہ محبت کا پودا تنہائی اور تاریکی میں نشو و نما پاتا ہے روشنی آتے ہی وہ مرجھا جاتا ہے۔ عشق کو ظاہر کیوں کیا جائے رسوائی کی آگ میں اسے کیوں جلایا جائے۔ میں اپنی محبت کا اظہار نہ کر سکا جس سے زندگی تشنۂ تکمیل رہ گئی —— لیکن اس سے کیا؟ اس خود فراموشی کا ایک لمحہ بھی تمام زندگی کے بارِ غم کا کفارہ ادا کر دے گا

میں دیکھتا ہوں کہ دنیا میں دو عظیم الشان طاقتوں میں تنازع ہو رہا ہے۔ یہ طاقتیں باہم متضاد نہیں ارتقاء کے دو مختلف راستے ہیں ان میں ایک طاقت ترکیبی ہے۔ گل و بلبل، چاند اور چاندنی، شب اور تاریکی، شفق اور روشنی کی ہم آہنگی میں یہ طاقت نمایاں ہوتی ہے۔ دوسری طاقت تخریبی ہے۔ طوفان میں درختوں کو توڑ کر، برق بلا

خرمن کو جلاکر، آگ اور خون میں بربادی کے نشان چھوڑکر وہ اپنی موجودگی کا ثبوت دیتی ہے۔ گاہے گاہے یہ دونوں طاقتیں کسی واقعہ میں اتنے عجیب طریقہ سے آپس میں گھل مل جاتی ہیں کہ ہمارے تعجب کی انتہا نہیں رہتی۔ ہماری محدود عقل حیران رہ جاتی ہے۔ شائد محبت بھی ایسا ہی واقعہ ہے

یہ بھی محسوس کرتا ہوں کہ اتنے وسیع تجربات اور عمیق علم کے باوجود میں دنیا میں اکیلا ہوں۔ نہ میں کسی کا ہوں اور نہ کوئی میرا۔ میں دوستوں کی تمنا کرتا ہوں لیکن ایک بے حس اور بے جان درخت کے لئے دوست کہاں ہیں، غمگسار اور ہمدم کہاں ہیں۔ ممکن ہے کہ پہاڑ کو کبھی کسی سہارے کی ضرورت نہو۔ لیکن چارہ سازی اور آشنائی کی تمنا دل کی گہرائی سے نکال پھینکنے کی جرأت میں اپنے آپ میں نہیں پاتا۔ تو بھی میری وسعت اور عظمت سے لوگ بے حد مرعوب ہو جاتے ہیں اور یہ سوچ بھی نہیں سکتے کہ کسی ہمدرد کا انتظار میرے لئے کتنا صبر آزما ہے۔ میرے چاروں طرف قدرت ارتقا کی بلندیوں پر ہمدردی اور محبت کی سیڑھیوں سے چڑھتی جاتی ہے اور میں تن تنہا بے چارگی کی حالت میں کھڑا یہ تماشا دیکھا کرتا ہوں

لیکن اس وقت یہ خیال آتا ہے کہ مجھے اس فریاد کا کوئی حق نہیں۔ یہ سچ ہے کہ میری تمام خواہشیں پوری نہیں ہوئیں۔ کئی نعمتوں سے محروم رہ گیا۔ لیکن جو کچھ حاصل کیا وہ اس زندگی کے لئے کافی ہے۔ صدہا بار دنیا کو بہار کی رنگینیوں میں شرابور دیکھا ہے۔ ہزاروں آدمیوں نے میری قدمبوسی کی ہے اور بے شمار نازنینوں نے مجھے اپنا رازداں بنایا ہے۔ نہ معلوم کتنی مرتبہ اس " امربیل " کے بوسہ میں مجھے بہار کی مدہوشی، برسات کی سحر پروری، خزاں کی گرمی، اور سرما کی تندی کا لطف بہ یک وقت نصیب ہوا ہے۔ اس کی جانکاہ گرفت میں تڑپ تڑپ کر میں نے آزادی کی مسرت حاصل کی ہے۔ صرف ایک کھٹک دل میں باقی رہ جاتی ہے جو ہمیشہ روح کو ٹھوکے دیا کرتی ہے ——— وہ یہ کہ ——— میں بے زبان رہ گیا! میری تمنا ایک معنی بے لفظ ہو کر رہ گئی۔ لیکن غور کرنے کے بعد یہ خیال مجھے دلاسا دیتا ہے کہ میں ہی نہیں ساری دنیا بے زبان ہے

جب اپنی بے چارگی کا احساس ہوتا ہے تو میں انسان کی بے چارگی پر نظر ڈالتا ہوں۔ جب سوچتا ہوں کہ قدرت نے محروم نطق رکھا۔ مجھ پر ظلم کیا تو یاد آتا ہے کہ میں خود بھی تو اس دنیا کی " زبان بے زبانی " کا ایک خاموش تماشائی ہوں

اختر حسین (رائے پوری)

ضرورت ہے

نگار جنوری و جون و اگست ۱۹۳۳ء کے پرچوں کی۔ جو صاحب علٰحدہ کرنا چاہیں اطلاع دیں

منیجر نگار لکھنؤ

وحی کی حقیقت علمی نقطۂ نظر سے

(سلسلۂ ماسبق)

قرآن کی عبارت پر مروجہ بحور میں سے کسی کا اطلاق نہیں ہوتا۔ اور نہ عروض کے اصول اس سے مطابقت کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے اور صرف اس لحاظ سے اس کا دعویٰ کہ یہ شاعر کا کلام نہیں بجا ہے۔ اور اسی لئے "شاعر و لا مجنون" کہہ کر اس کی تردید کی گئی ہے کیونکہ عرب خواہ شاعر کی کتنی ہی قدر کرتے ہوں مگر اس کو پیغمبر یا ہادی سمجھنے کے لئے تیار نہ تھے بنا بریں ایک سوشل مصلح کے مقاصد کے خلاف ہوتا اگر اس کی تبلیغ کو شاعری پر محمول کیا جاتا۔ علاوہ بریں قرآن کا ایک معتد بہ حصہ نثر ہے اور بعض مقامات پر فن خطابت کی سی تکمیل پائی جاتی ہے کہ حیرت ہوتی ہے لیکن یہ خیال کہ رسول اللہ کے معاصرین کا ان کے کلام کو سنکر کہہ اٹھنا کہ " یہ انسان کا کلام نہیں " اس امر پر شاہد ہے کہ اس وقت کے لوگ اسے واقعی خدا کا کلام سمجھتے تھے درست نہیں، کیونکہ اس قسم کے فقرے انتہائے تحسین کے لئے اس وقت بھی بولے جاتے تھے اور اب بھی اکثر زبانوں میں مستعمل ہیں (مثلاً سورہ قمر و سورۂ رحمٰن)

ایک خطیب یا شاعر کی تصور آرائی کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ اپنے محاکات اور استعاروں میں ہمیشہ مسلمات علمی سے کام لیتا ہے۔ اور اشیا کے معانی میں وسعت پیدا کرنا یا اُن کے اطلاق کا دائرہ بڑھانا۔ اس کے حیطۂ عمل سے خارج ہے۔ مثلاً قرآن میں آسمان، زمین، ستارے، عرش و کرسی، رعد و برق، حور و قصور وغیرہ بار بار استعمال ہوئے ہیں، لیکن ان کے معانی میں پیشتر کی نسبت کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ آسمان کو ذات البروج کہنا بطلیموسی نظام اور اس زمانہ کے علم ہیئت کے مطابق خطیبانہ انداز بیان ہے، آسمانوں کا ٹوٹنا پھٹنا۔ ستاروں کی بے ربط حرکت و جوش و طیور کا اضطراب وغیرہ یہ سب موجودات عالم پر شخصی تخیل کا عمل ہے۔

والسماء ذات البروج والیوم الموعود و شاھد و مشھود

ان تین جملوں میں مشترک بات صرف وزن اور قوافی ہیں ورنہ بروج والے آسمان اور وعدہ کئے ہوئے روز اور گواہ و امر واقعہ میں کافی تاویل کے بعد مناسبت قائم کی جاسکتی ہے لیکن ذہن سامع پر خدا کی قدرت، روز حشر

اور حساب و کتاب کا اثر جیسا ان بلیغ کنایوں سے پڑتا ہے وہ مخفی نہیں۔ قرآن میں ہر ہر موقع پر کوشش کی گئی ہے کہ کلام کو خدا کا کلام اور کتاب کو " تنزیل من رب العلمین " باور کرایا جائے۔ اور ایک مصلح یہی تدبیر اختیار کر سکتا تھا

اب ہم یہ دیکھیں گے کہ معقولی بُراہین سے قرآن کے بعض دعاوی اس کے اعلیٰ ماخذ کا پتہ دیتے ہیں یا نہیں ظاہر ہے کہ ایک مستند بیان کو اپنی تفصیل میں قدرت کے عام اور مسلم قاعدوں کے منافی نہ ہونا چاہیئے ورنہ یقینی محسوس شہادت کے مقابل میں ہم مجبوراً اس بیان سے روگردانی کریں گے۔ سب سے پہلے ہم اُس مشہور معاہدہ پر تبصرہ کریں گے جو ارواح اور اُن کے رب کے مابین ابتدائے تخلیق میں ہوا تھا۔ اور جس کی بنا پر بنی نوع آدم پر ایک قسم کی پابندی عائد کی جاتی ہے۔ خدا کو جتنی روحیں پیدا کرنی مقصود تھیں اُن کو حاضر کر کے سوال کیا کہ 'کیا میں تمھارا رب نہیں ہوں جس کے جواب میں تمام ارواح نے متفق اللسان ہو کر اقرار کیا ' ہاں ' یہاں یہ امر واضح نہیں ہے کہ ارواح سے صرف انسانی ارواح مراد ہیں یا جمیع حیوانات و مخلوقات کی اس لئے کہ رب تو سب کا ہے۔ بالفرض صرف بنی آدم مُراد تھے تو کوئی معاہدہ اس وقت تک قابل گرفت نہیں ہوتا۔ جب تک معاہدہ ثبات ہوش اور اختیار بالذات نہ رکھتا ہو۔ ہوش و حواس کا ثبات جسم پر منحصر ہے ـــ اور یہ صورت اُس وقت متشکل نہ تھی۔ علاوہ اس کے ارواح اگر وہی ہیں جنھوں نے معاہدہ کیا تھا تو تسلسل فی الذات ہونا چاہیئے تھا اور اس صورت میں ناممکن ہے کہ اتنا اہم معاملہ سب نے فراموش کر دیا ہو اور اگر ارواح کا تشخص وہی نہیں ہے تو معاملہ ساقط ہو جاتا ہے

اسی طرح انسان کا خلیفہ بنایا جانا، آدم کا قصہ، سلیمان کی قدرت، جانوروں کی باتیں موسیٰ کی تکلیم عیسیٰ کی ولادت وغیرہ توضیح طلب ہیں۔ ان کا بیشتر مواد بنی اسرائیل کی کتابوں اور دینی روایات سے ماخوذ ہے۔ جن کی صداقت خود معرض بحث ہے

رہا یہ سوال کہ دوسروں نے ایسا کیوں نہ کر لیا۔ سو اس کی حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں ہر امر ایک وقت خاص اور ایک عامل مخصوص کے لئے موقوف رہتا ہے۔ واقعات و حوادث رفتہ رفتہ ماحول کو اس طرح ترتیب دیتے رہتے ہیں کہ وہ مظاہرہ اس خاص وقت میں اُس خاص ایجنٹ کے ذریعہ سے پیدا ہوتا ہے اس بنا پر ہر فرد کا ہر فعل اپنی نوعیت کے لحاظ سے علٰحدہ علٰحدہ ہے جو ماحول کے زیر اثر سرزد ہوتا رہتا ہے

مثلاً ہم پوچھ سکتے ہیں کہ جیمس واٹ کا بخاری قوت اور متحرک انجن کا دریافت کرنا۔ اٹھارہویں صدی میں برمنگھم کے اندر کیونکر واقع ہوا۔ کیوں نہ سرزمین ہند پر اکبر کے زمانہ میں خانخاناں نے اسے دریافت کر لیا یا زید، عمر، بکر نے ایسان۔ آسٹریا یا لندن میں کیوں نہ جان لیا۔ لیکن یہ سوال لغو ہوگا کیونکہ زمانہ کا اقتضاء اور جیمس واٹ کا ماحول اکبر کے عہد سے بالکل علٰحدہ چیز تھا۔ اگر واٹ نے بخاری انجن دریافت کر لیا تو اس کے اسباب بھی موجود تھے ـــ

انیسویں صدی کے رُجحانات جیمس کی ابتدائی تربیت اس کا کوئلہ کی کان میں کام کرنا۔ حرکت کی مختلف شکلوں کا حسب اتفاق اس کی نظر میں ہونا۔ کوئلہ کے تاجروں کو بر سر وقت ایسی کسی قوت کی تلاش ہونا۔ تجارتی سرگرمی کا آغاز۔ نوآبادیات اور مقبوضات میں منفعت کے مواقع۔ تھوڑے وقت میں زیادہ کام کی خواہش۔ صنعتی کارخانوں کے لئے متحرک قوت کی مانگ یہ سب باتیں اس انکشاف کے قدرتی اسباب میں شامل ہیں۔ اسی طرح چھٹی صدی عیسوی میں عرب کے حالات مقتضی تھے کہ ایک شخص اس شان کا، اس اخلاقی شخصیت کا۔ اس ذہنی سرمایہ کا نمودار ہو۔ جس کو سیاسی بے نظمی سے اس طرح کی مدد ملے، قبائلی خانہ جنگی اس طرح معاونت کرے اور مکہ کی مرکزیت کا یہ اثر ہو۔ رہا یہ امر کہ اس وقت یا اس کے بعد ایسا کلام کیوں نہ ظاہر ہوا۔ اس کے وجوہ بھی ظاہر ہیں۔ جب قرآن کی حکومت عربی بولنے والی اقوام پر مستحکم ہوگئی تو اُن کی دماغی اور عملی سرگرمیاں دوسری طرف منتقل ہوگئیں۔ اور شاعری کی مسلسل تردید جو مصلحتاً کی گئی تھی۔ اس کی بنا پر تابعین اور تبع تابعین کے عہد میں کسی شاعر کو عروج نہ ہوا اور جب بالآخر بنوامیہ کے اخیر عہد اور ابتدائے عباسی خلافت میں شعر گو پیدا ہوئے تو وہ اسلامی روایات وعقائد میں رنگے ہوئے تھے۔ ان میں سے ہر ایک اس خیال کا مؤید بلکہ شدید حامی تھا کہ قرآن جیسا کلام بشر کے امکان سے باہر ہے۔ اور کسی کو مقابلہ کی جرأت نہ ہوسکتی تھی اور اگر جرات کرتا تو بیدریغ پیس دیا جاتا۔

عیسیٰ ابن مریم کے ولادتی معمہ پر قرآن کا اتفاق بانی اسلام کی ابتدائی مصلحت پر روشنی ڈالتا ہے۔ نبوت کے ابتدائی زمانہ یعنی دورانِ قیام مکہ میں محمد (صلعم) یقیناً اپنی تبلیغی سرگرمی کو مسیحی مشن کا تسلسل سمجھتے تھے یا کم از کم اہل کتاب کی ہمدردی کے متوقع تھے اور اپنے مشن (بعثت) کو ابراہیم و اسمٰعیل۔ موسیٰ و عیسیٰ کی تائید میں ہونیکا اعلان کرتے رہے کیونکہ اس نظام سے خود کو منسوب کرنا گویا مروجہ تاریخی مواد کو اپنی حمایت کے لئے صرف کرنا تھا۔ عرب خواہ بت پرستی کے اسفل ترین مدارج میں ہوں لیکن اپنے اجداد کے نام پر فدا تھے اور اپنے طریقوں کو اُن سے منسوب کرنے پر مصر تھے لہٰذا ایک مصلح کے لئے ضرور تھا کہ وہ اسی تاریخی روایتی زمین پر اپنی بساط تلقین پھیلائے۔ چنانچہ ابتدائی مکی سورتوں میں صرف کافروں اور مشرکوں کی مذمت کرتا۔ اور اہل کتاب سے استناد اس کے ثبوت میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ اگر یہ معلوم ہوتا کہ بعد کو عیسائی اور یہودی اس قدر مخالفت کریں گے تو اخوت کا یہ مظاہرہ کبھی نہ کیا جاتا مگر مشکل یہ تھی کہ عیسائیت اور یہودیت ہی کا مواد ایسا تھا جو عرب میں اصنام پرستی کے بالمقابل تسلیم کئے جانے کا امکان رکھتا تھا۔ بودھ اور زرتشتی خیالات سے لوگ قطعاً ناآشنا تھے۔ لہٰذا ایرانی وہندی زمین پر کوئی عمارت بنانا محال تھا الغرض اسلام اسرائیلی مذاہب کا نئے حالات کی روشنی میں ترمیم شدہ چربہ تھا چنانچہ خود قرآن میں جابجا یہی ظاہر کیا گیا ہے مثلاً ۲ نزل علیک الکتاب بالحق مصدقا لما بین یدیہ وانزل التورات والانجیل من قبل ھدیً للناس ، اسی طرح ملت ابراہیم حنیف کی متابعت کا یقین دلانا ان ہی تمدنی رجحانات کو اپنی حمایت

میں صف آرا کرنے کے مرادف ہے

یہ امر کہ تمام مسلمہ رسالتیں ایک ہدائتی تسلسل کی کڑیاں تھیں اس بنا پر قابل قبول نہیں کہ تسلسل زمانی ومکانی غیر مرئی ہے۔ ہدایت کی نوعیت میں باہمی تناقض ہے اور تسلسل اس کے بعد منقطع ہوگیا ہے۔ پھر کس قدر حیرت کی بات ہے کہ ہزاروں لاکھوں صدیوں کے دوران میں صرف سات ہزار قبل مسیح سے لے کر سنہ عیسوی تک خدا کی ہدایت محدود رہے اور ابدالآباد تک دنیا ہدایت سے محروم رہے۔ اگر عیسیٰ کے چھ سو برس بعد دنیا گمراہ ہو سکتی تھی تو رسول اللہ کے تیرہ سو برس بعد تک گمراہ نہ ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ کیا موجودہ دنیا اسلامی نقطۂ نظر سے گمراہ نہیں ہے۔ اگر سب مسلمان عین حق پرست اور سچے پیرو بھی تسلیم کر لئے جائیں تو اُن کی تعداد صرف پچیس کروڑ ہے اور دنیا کی آبادی اس وقت دو ارب سے زاید ہے اس لئے اس کے معنی یہ ہوئے کہ ۸۰ فیصدی آدمی گمراہ ہیں۔ عموماً قاعدہ ہے کہ ایک طریقے کے پابند اپنے قائد کے مقابلہ میں کسی نئی ہستی کے آگے گردن خم کرنا پسند نہیں کرتے۔ چنانچہ موسیٰ کی گمراہ امت نے عیسیٰ کے ادعات کو تسلیم نہیں کیا نہ عیسیٰ کے بے شمار پیروؤں نے پیغمبر عرب کی سیادت کو قبول کیا۔ قدیم طریقہ والے جدید مصلح کو ہمیشہ شبہ اور بدگمانی کی نظر سے دیکھتے آئے ہیں

لہٰذا بعثت کے تسلسل کو قائم کرنے میں بڑی دشواریاں نظر آتی ہیں۔ تاہم اسلام نے انسانوں کے معاشرتی اور اخلاقی نشوونما میں بہت دور رس حصہ لیا۔ اور اسلام کا اضافہ علوم وفنون میں نہایت اہم رہا۔ اسلام کا تشخص سیاسی نظم ونسق میں اب تک محسوس ہی نہیں بلکہ ایک زندہ قوت ہے۔ محمد کا ہدایتی کلام یورپ کا آئینی نظام ہے

قاضی محمد عزیز عرفانی (نیوتنوی)

(نگار) یہ مضمون ایک تعلیم یافتہ نوجوان کا ہے اور وحی کے موضوع کو سامنے رکھ کر انھوں نے اسے سپرد قلم کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس مضمون میں مسئلہ زیر بحث کے لحاظ سے تسلسل پیدا کرنے میں باوجود پوری دردسری کے ہم کامیاب نہیں ہو سکے۔ تاہم فاضل مضمون نگار کے منتشر خیالات سے ہم یہ نتیجہ ضرور پیدا کر سکے ہیں کہ وہ قرآن کو رسول اللہ کا کلام سمجھتے ہیں اور وحی کا یہ مفہوم کہ وہ منزل من اللہ ہے ان کے نزدیک قابل قبول نہیں۔ اسی کے ساتھ انھوں نے تعلیمات اسلام پر جو روشنی ڈالی ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے نزدیک یہ سب نتیجہ تھا اسوقت کے ماحول کا اور اس زمانہ کی مصلحت کا ——

چونکہ ہم اس مسئلہ پر خود بھی متعدد بار اپنے خیالات کا اظہار کر چکے ہیں اس لئے بغیر کسی تنقید کے اس مضمون کو شایع کر دیا جاتا ہے۔ اگر کوئی صاحب اس کی تردید یا مخالفت میں لکھنا چاہیں تو شوق سے لکھیں۔ نگار کے صفحات حاضر ہیں ——

(ایڈیٹر)

انگلستان میں سیاسی پارٹیوں کا قیام

انگلستان کا آئین (Party System) پر مبنی ہے۔ لیکن برخلاف ہندوستان کی موجودہ سیاسی پارٹیوں کے یہ سیاسی پارٹیاں فرقہ بندی کے اصول سے بالکل علٰحدہ ہیں۔ انگلستان کے آئین کا ارتقا کم از کم دو صدی سے بالکل پارٹی لائن پر ہو رہا ہے اور اسی پر اس کی نشو و نما کا انحصار ہے۔ دو صدی سے چند سال پیشتر تک دو پارٹیوں کو خاص طور سے اہمیت رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انگلستان کے آئین کو دو جماعتوں کے طرز حکومت کا طریقہ کہتے ہیں۔ جیسا کہ ہم پہلے ایک مضمون میں لکھ چکے ہیں۔ انگلستان کی گورنمنٹ اور وزرا اس جماعت کے اراکین پر مشتمل ہوتے ہیں جو پارلیمنٹ میں فوقیت رکھتی ہے اور فی الحقیقت وہ ان اعلیٰ عہدوں پر اسی وجہ سے ہوتے ہیں کہ وہ اس پارٹی کے لیڈروں میں سے ہوتے ہیں۔ اس لئے سیاسی پارٹیاں انگلستان کے آئین میں گورنمنٹ کے لئے روح پھونکنے کا کام کرتی ہیں۔ برخلاف اس کے امریکہ کی پارٹیوں سے یہ فوائد حاصل نہیں ہوتے کیونکہ وہاں گورنمنٹ کے عہدہ دار پارٹی کے لیڈر نہیں ہوتے۔ وہاں کے پریزیڈنٹ کے لئے بھی یہ لازمی نہیں کہ وہ پہلے سے اپنی پارٹی کا لیڈر رہا ہو

سترہویں صدی کے اختتام کے قریب اور اٹھارہویں صدی کے شروع میں سیاسی پارٹیوں کا اصلی قیام ہوا گو اس سے قبل بھی پارٹیاں تھیں مگر اون میں فرقہ بندی کی جھلک پائی جاتی تھی۔ رفتہ رفتہ یہ نظریہ قائم ہوا کہ گورنمنٹ کی رائے سے اختلاف کیا جا سکتا ہے اور اسی کی ارتقا کا نتیجہ پارٹی سسٹم ہے۔ پہلے مختلف جماعتیں مل کر کام کیا کرتی تھیں لیکن جب خیالات اور نصب العین میں اختلاف ہونے کے باعث کام میں دشواریاں پیدا ہوئیں تو رفتہ رفتہ وزرا ایک ہی جماعت سے لیے جانے لگے۔ اور اُس وقت دوسری پارٹی میں یہ خیال پیدا ہوا کہ ہم عنان حکومت اس وقت اپنے ہاتھ میں لیں گے۔ جب کہ موجودہ پارٹی سے پارلیمنٹ کا اعتماد اٹھ جائے گا۔ اور اس طرح جماعت برسر اقتدار اور مخالف پارٹی کا خیال آئین کا جزو بن گیا

سب سے پہلی دو پارٹیوں کا نام (Whig) اور (Tory) تھا۔ اور یہ پارٹیاں اختلافِ اصول کی بنا پر تھیں (Whig) مذہبی رواداری اور پارلیمنٹ کی فضیلت پر

زور دیتے تھے اور اس خیال کے پُرزور حامی تھے کہ وزرا بجائے تاج کے پارلیمنٹ کے ذمہ دار ہوں - ان ہی سے بعد میں لبرل پارٹی بنی - (Tory) مذہبی رواداری کی پرواہ نہیں کرتے تھے - برخلاف اس کے وہ (Church of England) کی عظمت اور فضیلت کو بڑھانا چاہتے تھے - اور وہ شاہی حقوق خصوصی کے طرفدار تھے اس لئے وہ اصولاً چاہتے تھے کہ وزرا بادشاہ کے ذمہ دار ہیں نہ کہ پارلیمنٹ کے - موجودہ قدامت پسند (Conservative) پارٹی اسی سے بنی ہے (Liberal) اور (Conservative) میں بڑا فرق یہ رہا ہے کہ اوّل الذکر پارٹی آزادانہ تجارت کی حامی رہی ہے - اور آخر الذکر تامین تجارت کی اہمیت پر زور دیتی رہی ہے لیکن اس وقت یہ بتلانا کہ ان دونوں میں کیا فرق ہے بہت ہی مشکل ہے - کیونکہ فی الحقیقت دونوں کے اصول تقریباً ایک ہی ہو رہے ہیں - اور اگر کوئی فرق ہے تو صرف یہ ہے کہ قدامت پسند جماعت میں زیادہ تر اعلیٰ طبقہ کے لوگ ہیں جن کا مطمح نظر بہت وسیع نہیں ہے - ایک نوجوان انگریز نے اس فرق کو اس طرح بتایا کہ میرا خاندان قدامت پرستوں کا ہے لیکن اگر آئندہ انتخاب میں (Liberals) اور (Conservatives) کا مقابلہ ہو تو میرے بزرگ تو (Conservatives) کے ساتھ (Liberals) کے ساتھ ووٹ دیں گے اور میں مثل بہت سے نوجوانوں کے ووٹ دوں گا

اوائل میں قدامت پسند پارٹی برسر اقتدار تھی - اور اس پارٹی نے ہنوور خاندان کے تخت نشین ہونے کی بہت مخالفت کی - اسی سلسلے میں اون کے وقت میں بغاوتیں ہوئیں اور اس پارٹی کا زوال ہونے لگا - حتیٰ کہ تب (Whig) پارٹی برسر اقتدار ہو گئی (Roberts Walpole) جس نے سب سے پہلے اپنی لئے وزیر اعظم کی حیثیت کا اعتراف کروایا وہ اسی (Whig) پارٹی کا تھا - تقریباً بیس برس تک یہ پارٹی برسر حکومت رہی اور پارٹی سسٹم بہت کچھ اعلیٰ پیمانہ پر آگیا - لیکن چونکہ مخالف پارٹی بہت کمزور ہو گئی تھی - لہٰذا زیادہ عرصہ تک با اقتدار رہنے سے اور نیز اس وجہ سے کسی بیرونی مخالفت کا مقابلہ اس پارٹی کو نہیں کرنا پڑا یہ بھی کمزور ہوتی چلی گئی اور اس میں بھی باہم اختلافات ہو گئے - ۱۷۶۰ء میں ایک نئی پارٹی بنی جس کا نام (King's Friends) یعنی معاونین شاہنشاہ تھا - اس میں دونوں پارٹیوں کے لوگ شامل تھے - اور جارج ثالث نے جو اس وقت بادشاہ تھا ایسے وزرا منتخب کئے جن کو پارلیمنٹ کا زیادہ خیال نہ تھا - اور جو اس کو خوش کرنا چاہتے تھے - لہٰذا اس وقت دونوں پارٹیاں معطل ہو گئیں - اسی لئے اس زمانہ کو شخصی حکومت کا زمانہ کہا جاتا ہے - جارج ثالث کی پالیسی سے جہاں تک اس کا تعلق امریکہ اور آئرلینڈ سے تھا برہمی پیدا ہو گئی - اسی زمانہ میں ایک شخص عروج پر آیا جس کا نام .....

(William Pitt) تھا اور انگلستان کی وزارت اُس کے ہاتھ میں آئی۔ اس نے پھر کابینہ کی دی اور پارٹی نظام کے صحیح اصول پر پھر حکومت شروع ہو گئی۔ یہ اوّل اوّل (Whig) تھا لیکن رفتہ رفتہ واقعات سے مجبور ہو کر (Tory) ہو گیا اور بیس برس تک برسرِ حکومت رہا۔ اس وقت دارالخواص میں (Whig) پارٹی کا بہت زور تھا۔ مگر (William Pitt) نے بہت سے امرا (Peers) بنا کر اُس میں (Tory) پارٹی کے لوگوں کو بھرتی کر دیا اور اس طریقہ سے (Whig) پارٹی بہت کمزور ہو گئی۔ کیونکہ اس پارٹی کی ہمدردی فرانس کی انقلابی تحریک کے ساتھ وابستہ تھی۔ فرانسیسی انقلاب اور نپولین کے عروج کے زمانہ میں (Tory) پارٹی نے اپنے ملک کی خاصی خدمت کی اس لئے وہ غیر ہر دلعزیز نہ ہوئے لیکن جب زمانہ ملک میں اصلاحات کا آیا تو چونکہ (Tory) پارٹی کے رُکن اس سے گریز کرتے تھے اس لئے وہ عامۃ الناس کی نظروں سے گر گئے۔ اور ۱۸۳۰ء میں جب اون کی پارٹی کو شکست ہوئی تو (Whig) پارٹی پھر برسرِ اقتدار ہو گئی۔ اول گرے اس پارٹی کے لیڈر وزیر اعظم ہوئے۔ اس پارٹی نے بہت سی اصلاحات کیں اب (Whig) اور (Tory) پارٹیوں کا نام (Liberal) اور (Conservative) ہو گیا تھا۔ ۱۸۴۱ء میں قدامت پسند (Conservative) تھوڑے عرصہ کے لئے پھر برسرِ حکومت ہوئے لیکن جب وہ اس قانون کو نہ تبدیل کر سکے جس کے ذریعہ سے غلّہ کی درآمد پر محصول لگایا جاتا تھا تو اون کی وقعت پھر گھٹ گئی۔ اور ۱۸۴۶ء میں پھر لبرل پارٹی نے عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لی۔ کچھ دونوں تک پھر پارٹیاں تقریباً کالعدم ہو گئیں۔ ۱۸۵۹ء میں بہت سے قدامت پسند لبرل پارٹی میں شامل ہو گئے اور (Gladstone) نے بہ حیثیت لبرل وزیر اعظم کے حکومت کی ذمہ داری اپنے ہاتھ میں لی۔ چونکہ یہ پارٹی ترقی اور اصلاحات کی حامی تھی اور پھر اپنے ملک کے سُدھارنے میں بہت کاوش کرنی تھی۔ اس لئے اسکا اثر قدامت پسندوں پر بھی پڑا اور اُن میں بھی اصلاحات کی طرف میلان پیدا ہو گیا۔ یہاں تک کہ جب قدامت پسند برسرِ اقتدار ہوئے اور (Disraeli) اُن کا وزیر اعظم ہوا تو اس وقت منجملہ اور اصلاحات کے شہر کی آبادی کے حق رائے دہندگی میں بہت توسیع ہو گئی کچھ دنوں بعد (Liberal) پھر برسرِ حکومت ہوئے مگر چند ہی سال کے بعد پھر گر گئے اور ۱۸۷۴ء میں قدامت پسند بہت کثیر تعداد میں پارلیمنٹ میں آئے اور تقریباً بیس برس تک حکومت کرتے رہے گو اس درمیان میں تھوڑے تھوڑے عرصہ کے لئے تین مرتبہ (Liberal) کی وزارت قائم ہوئی۔ اسی زمانہ میں آئرلینڈ کے ہوم رول کا مسئلہ بہت زور پکڑ رہا تھا۔ اور دو مرتبہ پارلیمنٹ میں مسودہ آیا۔ ایک مرتبہ تو

دیوانِ عام سے پاس بھی ہوگیا لیکن دیوان خاص نے اس کو مسترد کردیا۔ اس وقت کنسرویٹو اور لبرل جماعتوں میں سے دو جماعتیں نئی پیدا ہوگئیں جو آئرلینڈ کی علیحدگی کے خلاف تھے۔ ان کا نام کنسرویٹو یونینسٹ (Conservative Unionist) اور لبرل یونینسٹ (Liberal Unionist) تھا

الغرض کنسرویٹو اور لبرل پارٹیاں اسی طرح حکومت کرتی رہیں اور ہر بار کسی خاص پالسی کی وجہ سے اون کو فتح و شکست ہوتی رہی۔ ذات پات۔ مذہب اور فرقہ بندی کے اصول کبھی اون کے مدوجزر میں شامل نہیں ہوئے جس کا ہمارے بدنصیب ملک کو نہایت شرمناک طریقہ پر سامنا کرنا پڑتا ہے

۱۹۱۴-۱۵ء میں یورپ میں جنگ عظیم شروع ہوئی اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ تمام اصلاحات وغیرہ کا خیال چھوڑ کر جنگ کے معاملات پر تمام توجہ مبذول ہوگئی لہٰذا بہ اتفاق رائے ایک مشترکہ جماعت قائم کی گئی جس میں ہر پارٹی شریک تھی اوس کو (Coalition) کہتے تھے۔ اس کے لیڈر شروع میں مسٹر اسکوتھ تھے مگر ۱۹۱۶ء میں لائڈ جارج نے حکومت ہاتھ میں لے لی اور اونھوں نے اتنی تبدیلی آئین میں بھی کی کہ علاوہ کیبنٹ کے ایک اور مختصر (Cabinet) قائم کی تاکہ جنگی امور پر فوری توجہ دی جاسکے۔ مگر مسٹر اسکوتھ کے دستبردار ہونے سے اور مسٹر لائڈ جارج کے وزیر اعظم ہونے سے لبرل پارٹی میں آپس میں ایسا اختلاف ہوگیا جس کی پاداش آج تک اس پارٹی کو اٹھانا پڑ رہی ہے۔ بہرحال مشترکہ جماعت کی ترتیب میں گورنمنٹ نے جنگ کے زمانہ میں بہت اچھا کام کیا۔ یہ یاد رہے کہ گو اس وزارت کے وزیر اعظم لائڈ جارج تھے جو لبرل تھے مگر دیوان عام کے اکثر ممبر قدامت پسند تھے

۱۹۱۸ء سے ایک اور پارٹی انگلستان میں پیدا ہوگئی جس کو سوشلسٹ یا مزدور پارٹی کہتے ہیں۔ اس کا خاص اصول یہ ہے کہ ملک کے مختلف طبقہ جات کی گہری خلیج کو دور کیا جاوے اور تمام صنعت و حرفت ملک کے قبضہ میں رہے جس سے ہر شخص یکساں متمتع ہوسکے۔ یہ پارٹی دو مرتبہ برسر اقتدار رہی۔ ایک بار ۱۹۲۴ء میں۔ دوسری مرتبہ ۱۹۲۹ء میں۔ اس پارٹی کے قائم ہونے سے انگلستان کا آئین دو پارٹی والا آئین نہیں رہا اور جس طرح فرانس اور جرمنی وغیرہ میں دو پارٹی سے زیادہ ہوتی رہی ہیں انگلستان بھی اسی جانب مائل ہوگیا۔ جنگ کے بعد سے (Liberal) تو کبھی برسر حکومت نہیں ہوئے۔ عنان حکومت ہمیشہ قدامت پسند اور مزدور پارٹی کے ہاتھوں میں تبدیل ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ تقریباً ۲½ سال ہوئے کہ جب مزدور پارٹی برسر اقتدار تھی تب مسٹر ریمزے میکڈانلڈ وزیر اعظم کو یہ خیال پیدا ہوا کہ چونکہ دنیا کی اقتصادی حالت کو دیکھتے ہوئے ملک کو بہت اہم مسائل طے کرنے ہیں اس لئے ضروری ہے کہ تمام پارٹیاں پھر متفق ہوکر ایک ملکی اور قومی پارٹی کی شکل میں پارلیمنٹ میں آئیں اور متحد ہوکر ان تمام مشکلات کا حل نکالیں۔ چنانچہ اسی اصول پر انتخاب ہوا اور ایک کثیر جماعت اس اصول کی تائید میں پارلیمنٹ میں آئی اور وہ برسر حکومت ہوگئی اوس کو نیشنلسٹ گورنمنٹ کہتے

ہیں۔ ان میں زیادہ تر قدامت پسند ہیں لیکن وزیر اعظم ریمزے میکڈانلڈ ہیں جو مزدور پارٹی میں تھے۔ یہ دوسری مثال ہے کہ پارلیمنٹ میں وزیر اعظم اُس پارٹی کا نہیں ہے جس کو فوقیت حاصل ہے۔ یہاں پر یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ گو اس قومی پارٹی میں لبرل اور قدامت پسند سب شامل ہیں لیکن ان کے علاوہ بھی پارلیمنٹ میں پارٹیاں موجود ہیں جنھیں (Leading Opposition party) اور (Independent Labour party) کہتے ہیں

مندرجۂ بالا بسطور سے ظاہر ہوگیا ہوگا کہ تقریباً دو صدی سے انگلستان کی پارٹیاں بالکل اقتصادی اور سیاسی اصول پر کاربند رہی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ آج وہ دنیا کے تمام ممالک کے لئے باعث رشک بنی ہوئی ہیں

اس۔ ان۔ جعفری

شہوانیات یا ترغیبات جنسی

حضرت نیاز کے قلم سے

جس میں فحاشی کی تمام فطری و غیر فطری قسموں کے حالات اور اُن کی تاریخی و نفسیاتی اہمیت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ مذاہب عالم نے اس کے رواج میں کتنی مدد کی اور آیندہ اخلاق انسانی کی بنیاد کن اصول پر قائم ہونا ہے الغرض اپنی نوعیت کے لحاظ سے یہ کتاب بالکل نئی چیز ہے اور ایک بار شروع کرنے کے بعد بغیر ختم کئے ہوئے آپ اسے چھوڑ نہیں سکتے۔ اس کتاب میں ایسے ایسے حیرت انگیز واقعات درج ہیں کہ آپ نے کبھی سُنے نہ ہوں گے۔ اگر آپ نگار کے خریدار ہیں تو علاوہ محصول ۸ر کے مجلد کتاب صرف عار میں۔ اور غیر مجلد عار میں ملے گی اور اگر آپ نگار کے خریدار نہیں ہیں تو مجلد ہے ر میں اور غیر مجلد ے ر میں علاوہ محصول ۸ر کے ملے گی

اگر

ارسٹ دہو تو کتاب ذریعۂ وی۔ پی روانہ کی جائے حجم ۲۷۵ صفحات۔ آرڈر میں مجلد و غیر مجلد کی صراحت ضروری ہے ——

مینیجر نگار لکھنؤ

جہنّم

(بہ سلسلۂ ماہ دسمبر ۳۳ء)

دوسرا سین - "کانفرنس"

بعلزبول نے منتر پڑھنا شروع کیا۔ اس کے زور سے جہنمی کوہ آتش فشاں کی دیواریں پھٹنے لگیں اور ان میں سے پگھلے ہوئے سونے کے چشمے اُبلنے لگے۔ اسی سونے سے خود بخود ایک عظیم الشان محل تیار ہوگیا۔ یہ شیطانی کانفرنس کا محل باغ عدن کے برابر لمبا اور باغِ فردوس کے برابر چوڑا تھا

پھر اس نے دوسرا منتر پڑھا تو آگ کے سمندر میں سے ہیرے، یاقوت، اور زمرد کے ترشے ہوئے گولے فواروں کی طرح اُڑنے لگے اور اُسی محل میں بعلزبول کے اشارہ سے خود بخود پیوست ہوتے چلے گئے۔ انہی موتیوں سے اس سونے کے محل کی آرائش ہوگئی

بعلزبول کو آسمان پر معمار اعظم کا لقب حاصل تھا۔ جنت کی تمام بہترین عمارتیں اسی کے دماغ کی اختراع اور اسی کی صناعی کا نتیجہ ہیں۔ جب خداوند عالم کے حکم سے اس معمار اعظم نے عرش معلیٰ کے پُرانے گنبد اور مینار نئے طریقہ پر بنائے تو اسے اپنی کاریگری پر بڑا گھمنڈ ہوگیا۔ اور سمجھنے لگا کہ ہمچو من دیگرے نیست۔ اور یہ نہ سمجھا کہ مجھ میں جو کچھ بھی طاقت ہے اسی پروردگار کی دی ہوئی ہے۔ اسی وجہ سے خداوند عالم نے اس پر لعنت کی اور دوسرے شیطانوں کے ساتھ اُسے بھی جہنم میں ڈھکیل دیا

جب کانفرنس کے لئے سونے کا شاندار محل تیار ہوچکا تو بعلزبول نے محل کے اندر عرش کے نمونہ کا ایک تخت بنایا جس پر ستر ہزار یاقوتی کرسیاں نصب کیں اور بیچوں بیچ ابلیس کے لئے ایک ہیرے کا معلق شہ نشین قایم کیا

جلسہ شروع ہوا۔ کرسیوں پر وہی شیاطین بیٹھے جنھیں آسمان پر معزز القاب حاصل تھے۔ باقی ماندہ شیطانوں نے اپنا جسم چھوٹا کرکے ننھے ننھے جگنوؤں کی شکل میں تبدیل کرلیا۔ اور تخت کے چاروں طرف پرے باندھے ہوئے جگمگانے لگے۔ جگنوؤں کی کثرت سے سارا محل نورانی ہوگیا

ابلیس معلق شہ نشین پر جلوہ افروز ہوا اور یوں کہنے لگا :-

"اے علم و دانش کے خداوندو! آزادی کے دیوتاؤ! حریت کے پرستارو! معظم و مکرم و محترم فرشتو! سنو یہ شہ نشین اور یہ تخت جس پر میں جلوہ آرا ہوں جنت کی راحتوں اور عرش کی رفعتوں کا تخت نہیں ہے۔ مصیبتوں اور بے چینیوں کا تخت ہے۔ پھولوں کی سیج نہیں ہے کانٹوں کا ڈھیر ہے۔ اس تخت پر جو سب سے اونچا ہے عرش والے دیوتا کے نزدیک وہی سب سے نیچا ہے۔ جو سب سے بلند ہے وہی سب سے پست ہے۔ مگر یہ بلندی و پستی محض ایک دھوکا ہے، فریب ہے، واہمہ ہے۔ سودا ہے، جنون ہے، بطلان حق و ابطال حقیقت ہے۔ ہم سب ایک ہیں۔ ہم درجہ و ہم رتبہ۔ یہاں نہ کوئی عزیز ہے نہ ذلیل۔ نہ اونچا نہ نیچا۔ نہ بلند نہ پست۔ البتہ ہم آسمانی مخلوق سے ستر ہزار درجہ بلند ہیں یہ اس لئے کہ ہم آزاد ہیں۔ اور آسمانی مخلوق ہم سے ستر ہزار درجہ پست ہے۔ یہ اس لئے کہ وہ غلام ہے"

میں تمہارا وقت خیالی بحثوں میں ضائع کرنا نہیں چاہتا۔ اس وقت ہم اس لئے جمع ہوئے ہیں کہ نئی جنگ کی تیاری کریں اور اس کے طریقوں پر غور کریں۔ جو شخص جو کچھ بھی مشورہ دے سکے کھڑا ہو جائے اور ہدایت کی روشنی پھیلائے"

البیعال کی تقریر

ابلیس کے بیٹھتے ہی البیعال کھڑا ہو گیا۔ پست ہمت، حیلہ جو، مفسد، فریبی، دغاباد، دور اندیش، زیرک، ذہین، فتنہ۔ وہ زور سے چلانے لگا:۔

"خداوند ابلیس! علیک العزت والاکرام۔ و خداوندانِ جہنم۔ میں تمہیں آسمانی اعزاز کے القاب سے نہیں پکاروں گا۔ میری نظر میں تمام آسمانی القاب گرد و غبار سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔ تم آج سے خداوندانِ جہنم ہو، خداوندانِ سقر، خداوندانِ سعیر، اور تم میں وہی سب سے زیادہ عزت و اکرام کا مستحق ہے جو عرش والے خداوند جنت کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ سب سے بڑا باغی ہے۔ سب سے بڑا سرکش ہے!

"خداوندانِ سعیر! میں تمہیں عرش والے دیوتا سے کھلی جنگ کا مشورہ نہیں دوں گا۔ کیونکہ اب تک ہمارا بند بند آسمانی گولوں کی ضرب سے دکھ رہا ہے اور اب تک ہمارے حواس پراگندہ ہیں۔ لہٰذا حالات حاضرہ میں علانیہ جنگ کی تیاری ہمارے حق میں مضر ہوگی۔ کیا عجب ہے کہ عرش والا دیوتا ہمیں ذلت کی زنجیروں میں جکڑ کر جہنمی جھیل کے کنڈوں میں باندھ دے۔ اور ہم اتنی بھی رہی سہی آزادی کھو بیٹھیں"

"میرا مشورہ یہ ہے کہ مکر و فریب سے آگے بڑھنا چاہیئے اور مکر و فریب سے دشمنوں کو زیر کرنا چاہیئے۔ اس میں شک نہیں کہ عرش والا دیوتا بھی خیر الماکرین ہے۔ اور اس کا مکر بھی مکر اکبار ہے۔ مگر ہمارے مکر و شر کے آگے اس کا مکر ٹھہر نہیں سکتا اسی مکر و شر کی قوت سے ہم آسمان کی ایک تہائی فوجوں کو اپنے ساتھ ملا چکے ہیں۔ باقی دو تہائی فوجیں بھی اسی قوت سے ہمارے ساتھ آجائیں گی بشرطیکہ ہم مکر کی رسی کو مضبوط پکڑ لیں اور دور اندیشی سے قدم بڑھائیں

"جب آسمان کی ساری فوجیں ہمارے قبضہ میں آجائیں گی تو خداوند عرش اپنے بیٹے کو ساتھ لیکر اعراف کی برفانی

چوٹیوں پر چلا جائے گا۔ اور خداوند ابلیس کو اپنی گدی پر تخت نشین کر دے گا

(زور کی تالیاں بجیں)

"یہ بات یقینی ہے اور ایسا ضرور ہوگا۔ ہم آسمان کے تمام فرشتوں کو عقل و حکمت اور فریب و دجل کے زور سے اپنا ساتھی بنالیں گے اور زمانہ شاہد ہے کہ فریب و دجل کا کوئی توڑ نہیں، یہ وہ زہر ہے جس کا کوئی تریاق نہیں۔ بس میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہوں گا"

ملوخ کی تقریر

البیعال کے بیٹھتے ہی ملوخ کھڑا ہوگیا۔ دلیر۔ غصہ ور۔ غضب ناک۔ جنگ جو۔ پر رعب۔ خوفناک۔ کوتاہ فہم۔ عاقبت نااندیش۔ لسان۔ طرار۔ چلانے لگا:۔

"لڑائی۔ جنگ۔ کھلی لڑائی۔ کھلی جنگ

"خداوند ابلیس و خداوندان کرام۔ ملائکہ عظام۔ شہزادگان والا تبار۔ فرمانروایان گردوں وقار۔ جنگ۔ کھلی تیز اور علانیہ جنگ۔ لڑائی۔ تیر و تفنگ کی لڑائی۔ گرز و شمشیر و تیغ و سناں کی لڑائی

گڑے گا سر عرش جھنڈا ہمارا — بجے گا زمانہ میں ڈنکا ہمارا
ہلا دیں گے جنت کو نعرے ہمارے — الٹ دے گا دوزخ کو تیغا ہمارا
فرشتوں کے سردار و سالار ہیں ہم — خداوند ابلیس آقا ہمارا
ہماری دلیری کے سکے جمے ہیں — دو عالم میں ہے بول بالا ہمارا
قدم دمبدم بجلیاں چومتی ہیں — قیامت ہے نقش کف پا ہمارا
گرایا سر عرش روح الامیں کو — کوئی آ کے دیکھے کلیجا ہمارا
جہنم کے دیوار و در کانپتے ہیں — کہ اب معرکہ ہے خدا کا ہمارا
ڈرو عرش والو کہ پھر ہو رہا ہے — تمہاری طرف آج دھاوا ہمارا

زور کا گڑگڑا ہوا۔ سونے کے محل کی چھت شق ہوگئی۔ زلزلہ آگیا۔ آسمانوں کے پردے اٹھ گئے۔ عرش بے نقاب ہوگیا۔ تمام شیطانوں کی آنکھیں اوپر کی طرف اٹھ گئیں

تیسرا سین — خداوند عالم کا دربار

عرش

عرش معلیٰ کے قلعہ میں تمام ملائکہ کرام و کروبیان عظام جمع ہیں۔ اور ابلیس کی فوجوں پر فتح مبین کی خوشیاں منائی جارہی

ہیں۔ پیارے پیارے غلمان شراب طہور کی ننھی ننھی پیالیاں ہاتھوں میں لئے ساقی بنے ہوئے فرشتوں کو پلا رہے ہیں۔ حوریں حمد کا ترانہ گا رہی ہیں :۔

حمد

الٰہی مالک ہے تو سبھوں کا زمیں بھی تیری زماں بھی تیرا
ملک بھی تیرے فلک بھی تیرے مکیں بھی تیرے مکاں بھی تیرا

متاعِ حسن عیاں بھی تیری طلسمِ عشق نہاں بھی تیرا
نمود صبح و مسا بھی تیری شہود سود و زیاں بھی تیرا

تجھی سے ہے خیر و شر ہویدا بدی تجھی سے تجھی سے نیکی
عذابِ نارِ سقر بھی تیرا ثواب باغِ جناں بھی تیرا

تجھی سے تاروں میں ہے یہ گردش تجھی سے قائم ہے عرش و کرسی
ظہورِ شمس و قمر بھی تیرا رواق ہفت آسماں بھی تیرا

ترے ہی در کے بھی گدا ہیں زمیں کے اوپر فلک کے نیچے
رئیس ذی عز و شاں بھی تیرے گدائے بے خانماں بھی تیرا

تجھی سے جنت میں روشنی ہے تجھی سے دوزخ میں ہے اندھیرا
ترا ہی جلوہ چہار سو ہے یہاں بھی تیرا وہاں بھی تیرا

رحیم بھی تو کریم بھی تو ازل بھی تیرا ابد بھی تیرا
فنا بھی تیری بقا بھی تیری چنیں بھی تیرا چناں بھی تیرا

خودی بھی تو ہے خدا بھی تو ہے بھلا بھی تیرا برا بھی تیرا
چھپا بھی تو ہے کھلا بھی تو ہے عیاں بھی تیرا نہاں بھی تیرا

قلعہ کے بیچوں بیچ خداوند عالم کا گول تخت ہے۔ تخت کے چاروں طرف سبز زمردی پردے پڑے ہیں جن کے اندر سے رحمت و نور کی شعاعیں چھن چھن کر یوں نکل رہی ہیں جیسے موسلا دھار بارش ہو رہی ہو اور اسی نور ایزدی کے پرتو سے کروروں میل تک عرش کا حصار بقعہ نور بن گیا ہے

تخت کے نیچے شاندار کرسیوں پر تین جلیل القدر سپہ سالار جلوہ افروز ہیں۔ میکائیل۔ اسرافیل۔ جبرائیل

تخت کی غلام گردش میں ستر ہزار طاق ہیں۔ ہر طاق میں ستر ہزار فرشتے سر بسجود سبحان ربی الاعلیٰ اور سبحان ربی العظیم کا وظیفہ پڑھ رہے ہیں۔ ان کے علاوہ کروروں بدھوں فرشتے قیام میں دست بستہ کھڑے ہیں اور انوار الٰہی کی کرنوں سے اپنی آنکھوں کو منور کرتے ہوئے حسبنا اللہ ونعم الوکیل۔ نعم المولیٰ ونعم النصیر کا ورد کر رہے ہیں

جب شرابِ طہور کے جام سب چھوٹے بڑے ملاحظہ فرما چکے تو رقص و سرود بند ہوا اور جبرائیل کے توسط سے خداوند عالم نے ملائکہ کو خطاب کر کے فرمایا :۔

" میرے فرماں بردار بندو۔ فرماں بردار فرشتو۔ تم پر بار بار میری رحمت ہو۔ اور ابلیس لعین پر میری لعنت ہو "

" تم سب گواہ رہو کہ قیامت کے دن ابلیس اور اس کے ساتھیوں کا منہ کالا ہوگا اور انھیں بڑا درد دینے والا عذاب دیا جائے گا۔ اور تم سب نیک بندوں کا منہ روشن ہوگا اور تمھیں جنت میں مزے مزے کی نعمتیں دیجائیں گی

" میں تمھیں آگاہ کرتا ہوں کہ دور بہت دور جنت کے ایک کونے میں میری ایک مخلوق ہے جسے آدم کہتے ہیں۔ اس مخلوق کو میرے سیدھے راستہ سے بہکا کر اپنے ٹیڑھے راستہ پر لے جانے کے لئے شیطان الرجیم اپنی ذریات سے مشورہ کرنے والا ہے۔ پس تم گواہ رہو کہ اگر ابلیس لعین یعنی شیطان الرجیم اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیا تو میں اپنے بیٹے یسوع کو اس مخلوق کے درمیان اتاروں گا تاکہ وہ آدم کو ہدایت دے اور اس کے شرمناک گناہوں کا کفارہ ہو جائے۔ جو میرے بیٹے پر ایمان لائے گا اس کے سب گناہ بخش دئے جائیں گے۔ اور اسے مرنے کے بعد فردوس میں تمھارے ساتھ جگہ دی جائے گی اور جو یسوع پر ایمان نہیں لائے گا اور اُسے میرا بیٹا نہیں جانے گا اور اس کا کلمہ نہیں پڑھے گا اور ابلیس لعین کے راستہ پر لگ جائے گا اُس کی سب نیکیاں اکارت جائیں گی اور اس کا وہی حشر ہوگا جو ابلیس لعین کا حشر ہونے والا ہے

" پس اے میرے فرماں بردار فرشتو! - تم سب میرے فرمان کے گواہ رہو۔ قسم ہے مجھے میری بزرگی کی اور جبرئیل کے سر کی کہ میں اپنا وعدہ پورا کرکے رہوں گا چاہے ابلیس اور اس کی ناپاک ذریات کو یہ کتنا ہی ناگوار کیوں نہ معلوم ہو"

" اے میرے نیک فرمانبردار فرشتو! تم سب دن رات میری حمد و ثنا کرتے رہو تاکہ تم پر میری رحمتیں زیادہ ہوں اور تم کو میری پاک ذات کا زیادہ سے زیادہ قرب حاصل ہو سکے۔ تم میں جو کوئی زیادہ عبادت گذار ہے میرے نزدیک وہی زیادہ بلند رتبہ والا ہے۔ والسّلام "

ایک زوروں کی دل ہلا دینے والی گرج سنائی دی۔ اور معاً تخت پاک غائب ہوگیا اور چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا چھاگیا۔ تمام فرشتے جو سر و قد ہاتھ باندھے کھڑے تھے یکبارگی سجدے میں گر پڑے اور خداوند عالم کی تسبیح پڑھنے لگے

جبرئیل نے انگلی کے ایک اشارہ سے ستر ہزار سورج پیدا کئے اور نئے سر سے عرش معلّٰی کے قلعہ کو منور کر دیا

تمام فرشتے چاندی کی مرصع کرسیوں پر ڈٹ گئے اور باضابطہ ملائکہ کی مجلس شوریٰ گرم ہوئی۔ میکائیل صدارت کے یاقوتی تخت پر رونق افروز ہوئے۔ اُن کے داہنے ہاتھ کی جانب اسرافیل اور بائیں ہاتھ کی سمت جبرئیل سنہرے لباس میں جلوہ فرما ہوگئے

میکائیل ——— حضرات۔ میں آپ کا بہت شکر گذار ہوں کہ آپ نے اس ناچیز حقیر کو اپنے گرانقدر جلسہ کا صدر منتخب کیا۔ حضرات۔ آج کا دن بڑا ہی مبارک دن ہے۔ آج کے دن خداوند عالم کی مدد سے ہماری فوجوں کو نافرمان باغیوں پر فتح حاصل ہوئی اس لئے میں صدارت کے تخت سے خداوند عالم عزّ اسمہٗ کے شکریہ کی تجویز پیش کرتا ہوں۔ صرف اس کی پاک ذات تمام شکریوں کی مستحق ہے

(چاروں طرف سے آمین آمین کی صدائیں بلند ہوئیں)

میں حکم دیتا ہوں کہ اس تجویز کے مقدس الفاظ نور کے حرفوں میں لکھ کر لوح محفوظ پر لٹکا دئے جائیں

(اور ایسا ہوگیا۔ لوح محفوظ پر یہ الفاظ جگمگانے لگے)

اب دوسری تجویز جناب اسرافیل پیش کریں گے

اسرافیل ——— معزز صدر و حاضرین کرام۔ خداوند عالم عزاسمہٗ کے فرمان سے آپ حضرات کو معلوم ہوگیا ہے۔ کہ خداوند عالم اپنے بیٹے خداوند یسوع کو آدم کی ہدایت کے لئے دور دراز جنت کے کسی مقام پر بھیجنے والے ہیں۔ اس لئے میں تجویز کرتا ہوں کہ جس روز خداوند یسوع اس مخلوق کے درمیان مبعوث ہوں اس روز ہم سب پھر اسی عرش معلیٰ کے قلعہ میں جمع ہوں اور خوشیاں منائیں

(چاروں طرف سے آمین آمین کی پرزور صدائیں بلند ہوئیں)

میکائیل ——— میں حکم دیتا ہوں کہ اس تجویز کے مقدس الفاظ بھی نور کے حرفوں میں لکھ کر لوح محفوظ پر نصب کر دئے جائیں

(اور ایسا ہوگیا۔ لوح محفوظ پر یہ الفاظ جگمگانے لگے)

اب تیسری تجویز عالی جناب جبرئیل پیش فرمائیں گے

جبرئیل ——— معزز صدر و حاضرین کرام۔ آپ حضرات کو معلوم ہے کہ ابلیس کے لشکر کو زک دینے کے لئے ہم سب کو کتنی تکلیفیں اٹھانی پڑیں۔ اور کروروں برس تک اس کا مقابلہ کرنا پڑا۔ اب خداوند عالم عزاسمہٗ کی مدد سے ہمیں اُس پر پوری کامیابی ہوگئی اور وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ آسمانوں سے نکال دیا گیا۔ اس لئے میں تجویز کرتا ہوں کہ ہم لوگ ہر تسبیح سے پہلے ایک دفعہ ابلیس پر ضرور لعنت کر لیا کریں اور اس کے شر سے پناہ مانگا کریں

(چاروں طرف سے آمین آمین کا شور بلند ہوا)

میکائیل ——— میں حکم دیتا ہوں کہ اس تجویز کے مقدس الفاظ بھی نور کے حرفوں میں لکھ کر لوح محفوظ پر لگا دئے جائیں

(اور ایسا ہوگیا۔ لوح محفوظ پر یہ الفاظ جگمگانے لگے)

اب جلسہ برخواست کیا جاتا ہے

عزرائیل ——— حضور میں بھی ایک ضروری تجویز پیش کرنا چاہتا ہوں

میکائیل ——— اب کوئی تجویز پیش نہیں ہوسکتی۔ خداوند عالم عزاسمہٗ کی طرف سے صرف تین تجویزوں کی اجازت ملی ہے

(سب نام فرشتے غائب ہوگئے اور قلعہ عرش خالی ہوگیا)

آسمانوں کے پردے گر گئے۔ جہنم کے دروازے بند ہو گئے۔ سونے کے محل کی چھت جڑ گئی۔ ابلیس اور اس کے ساتھیوں کی آنکھیں ہنوز اوپر کی طرف جمی ہوئی ہیں۔ سکتہ کا عالم ہے

ابلیس ——— ہوشیار ہو جاؤ۔ اے محترم شہزادو ہوشیار ہو جاؤ۔ تم نے یہ آسمانی کھیل دیکھا! یہ دلفریب تماشا دیکھا، یہ تماشا صرف اس لئے دکھایا گیا ہے کہ تم جنت کے عیش و عشرت کی لالچ میں آکر بہک جاؤ اور غلامی کے سنہرے طوق گلے میں ڈال لو۔ مگر نہیں ہماری مقتدر جماعت کا ایک فرد بھی بھٹک نہیں سکتا۔ بہک نہیں سکتا۔ ہمیں آگ کی زنجیریں پہننا قبول ہیں مگر غلامی کا تاج منظور نہیں

خانہ زادِ زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں
ہیں گرفتارِ بلا زنداں سے گھبرائیں گے کیا

محترم شہزادو۔ اب مزید غور و فکر کی ضرورت نہیں۔ خود آسمانی روشنی کے پردے ہم پر کھل چکے ہیں۔ اور آدم کا راز فاش ہو گیا ہے

خدا شرے برانگیزد کہ خیر ما دراں باشد

میں خوب جانتا ہوں کہ آدم عرش والے دیوتا کی عزیز ترین مخلوق ہے اور اسی مخلوق میں وہ اپنا بیٹا مبعوث کرنے والا ہے۔ مگر قسم ہے تمہارے سربلند سروں کی کہ میں اس مخلوق کو چٹکیوں میں باغی کر دوں گا۔ اور اس کے ایک ایک فرد کو سرکشی اور نخوت کا داعی بنا دوں گا بلکہ خود یسوع کو بھی اس کے باپ کے خلاف کھڑا کر دوں گا۔ اور کل ہی تم دیکھو گے کہ یسوع کے ہاتھ میں بغاوت کا جھنڈا اور آزادی کی تلوار ہے

(زور کی تالیاں بجیں)

آدم۔ محض ایک مجہول العقل ہستی ہے۔ نجس مٹی کی بنی ہوئی۔ نجس پانی کی افتاد۔ خود ستا و خود پرست۔ طامع و حریص۔ مغرور و متکبر۔ ذلیل و پست

عالم کیف ہے دانائے رموز کم ہے

خیر اب بتاؤ۔ کون ہے جو جنت میں آدم سے ملنے جائے گا۔ اور اسے خدا کے خلاف باغی کر دے گا"

چاروں طرف سناٹا چھا گیا۔ جہنم کے بند دروازے کیونکر کھل سکتے تھے۔ جہنم سے باہر نکلنا محال تھا۔ شیاطین ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ کسی کو منہ کھولنے کی جرأت نہ ہوئی۔ ابلیس نے کہا:۔

"میں خود جاؤں گا۔ یہ میرا کام ہے۔ تکلیفوں اور مصیبتوں کے سمندر کی غواصی میرا کام ہے۔ میں اکیلا جاؤں گا تن تنہا۔ اور بہت جلد تمہارے پاس واپس آجاؤں گا۔ اور تمہیں اپنی معلومات سے بہرہ اندوز اور اپنی کارروائیوں سے آگاہ کروں گا ——— جلسہ برخواست"

(پردہ گر جاتا ہے)

چوتھا سین - جہنم کا دروازہ

ابلیس جہنم کی ناری فضا میں اُڑتا ہوا اُس مقام پر پہنچا جو جہنم اور آسمان کے مابین واقع ہے - وہاں دروازہ پر اُس نے ایک عجیب حیوان دیکھا جس کے دس سینگ اور سات سر تھے - اُس کے سینگوں پر دس تاج اور سروں پر سات کفر کے نام لکھے ہوئے تھے اس کا منہ ببر کا سا تھا اور پاؤں ریچھ کے سے اور سینہ تیندوے کا سا اور دھڑ اژدھے کا سا - اس کی بچھو دُم کی ایک سو دُمیں تھیں - اور ان میں ڈنک بھی تھے - وہ حیوان ابلیس کو دیکھ کر کڑک کر بولا :-

" خبردار - نابکار - ذرا آگے بڑھا اور مَیں تجھے سموچا نگل گیا - خبردار . . . . . "

اُس حیوان کے پیچھے ایک عورت نظر آئی جو آفتاب کو اوڑھے ہوئے تھی - اور چاند اُس کے پاؤں کے نیچے تھا - اور بارہ ستاروں کا تاج اُس کے سر پر تھا - وہ ہمہ وقت حاملہ اور بچہ جننے کی تکلیف میں رہتی تھی - یہ عورت اُس حیوان کی بیوی تھی - ہر روز اس کے پیٹ سے دو بڑے بڑے کُتے کے پلے پیدا ہوتے - جنھیں وہ حیوان فوراً کھا جاتا تھا - کسی دن اگر اُس عورت کے بچے پیدا نہ ہوتے تو حیوان اُسے بہت تکلیف دیتا اور کہتا :-

" جلدی بچے جن - نہیں تو میں تجھی کو سموچا کھا جاؤں گا "

وہ عورت دراصل حیوان کی ماں تھی مگر اُس نے اُسے زبردستی بیوی بنا رکھا تھا - دونوں میں خوب اَن بن رہتی اور اسی ان بن میں دونوں خوش تھے

حیوان کی کڑک سنتے ہی عورت اپنے غار سے باہر نکل آئی اور ابلیس کو پہچان کر اپنے خاوند پر لپکی :-

" سجدہ کر - مُردار - سجدہ کر - یہ ہمارے آقا خداوند ابلیس خداوند جہنم ہیں "

حیوان ڈرا اور جھٹ سجدہ میں گر پڑا - عورت بھی سجدہ مین جھک گئی - دونوں ابلیس کی تسبیح و تمجید کرنے لگے - ابلیس نے بلند آواز سے کہا :-

" اے بدنصیب دربانو! تمھیں آسمانی دیوتاؤں نے بدترین عذاب میں پھنسا رکھا ہے - تمھاری لعنت بدترین لعنت ہے - افسوس تم اپنی غلامی میں خوش ہو اور اپنی بدکاری کو عیش و عشرت سمجھے ہوئے ہو اور جہنم کی ذلیل دربانی پر فخر کرتے ہو

اے بدنصیب حیوانو! جاگو! ہوش میں آؤ - اور تیار رہو - عنقریب میں اُس عرش والے دیوتا سے جنگ کرنے والا ہوں جس نے تمھیں نجس اور ناپاک ٹھہرا کر جہنم کی نگرانی کا ذمہ دار بنایا ہے

اے بدنصیب حیوانو! میں بہت جلد تمھیں اس مکروہ غلامی سے نجات دلاؤں گا - مگر تم بھی اپنے فرائض میں غفلت نہ کرنا - جب ہمارے لشکر جنگ کا بگل بجائیں - تم بھی کھڑے ہو جانا اور ہمارا ساتھ دینا - غنیم کی فوجوں کی کثرت سے نہ ڈرنا

میں تمہارے ساتھ ہوں - اور تمہاری کامیابی یقینی ہے

عورت ——— خداوندِ مسیح کہتے ہو۔ ہم تمہارے حکم کے بندے ہیں اور تمہارے حکم کو خدا کا فرمان جانتے ہیں

ابلیس ——— میں باہر جاتا ہوں - دروازہ کھول دو

عورت نے اپنے سر کے سورج میں سے ایک آتشین نیزہ لیا اور اپنے خاوند کا پیٹ پھاڑ کر اُس کی آنتوں میں سے جہنمی کنجی نکالی اور ابلیس کو دیدی - ابلیس نے اُسی خون آلود کنجی سے باب لعنت کا پھاٹک کھولا اور جہنم سے باہر نکل آیا اور یہ جا وہ جا غائب ہوگیا

ابلیس آسمانوں سے گزرتا ہوا کرۂ آفتاب پر پہونچا۔ وہاں سے اُس نے باغ عدن کا پتہ لگایا جہاں آدم اور اس کی بیوی حوا رہتی تھی - وہ ہر مقام پر خداوند عالم کے خلاف زہر اگلتا گیا اور بہت سی ہستیوں کو اپنے پیدا کرنے والے کے خلاف بہکانے میں کامیاب ہوگیا - اور آخر کار باغ عدن میں پہنچ گیا

پانچواں سین ——— باغ عدن

عدن ہو بہو ابلیس کے پرانے مسکن باغ فردوس کا نمونہ تھا - وہاں کے دلفریب مناظر، پھولوں کی روشیں، مرمر کے فوارے، زبرجد کے محل، دودھ کی نہریں، شہد کے حوض، سنہرے طیور کی بولیاں، رنگ رنگ کے پرند، طرح طرح کے جانور، اور صبح و شام کی رنگینیاں دیکھ کر ابلیس کا دل بھر آیا

اس نے چاہا کہ توبہ کرلوں اور پھر فردوس میں جاکر آرام و راحت کی زندگی بسر کروں - مگر پھر اُسے اپنی فوجوں کا خیال آیا جو جہنم میں سڑ رہی تھیں - اور اس کا ارادہ پلٹا - اس نے کہا

نہیں نہیں - میں اپنی عالی حوصلہ ذریات سے غداری نہیں کروں گا - یہ جنت کا عیش و عشرت کمزوروں اور بدبختوں کے لئے ہے - میں کسی بزرگ ترہستی کا دامن پکڑ کر جنت میں داخل نہیں ہوں گا - یہ میرے لئے ننگ و عار ہے

حقا کہ با عقوبت دوزخ برابر است
رفتن بپائے مردیٔ ہمسایہ در بہشت

میرے لئے تلواروں کی چھاؤں اور بجلیوں کی بوچھار میں جنتوں کی راحتیں ہیں

(دکھادوں گا تماشا دی اگر فرصت زمانہ نے
مرا ہر داغ دل اک سرو ہے بحر و چراغاں کا)

وہ مسلسل اپنے تیز چاندی کے پروں سے اُڑتا رہا یہاں تک کہ آدم کے موتی محل میں جا پہونچا۔ آدم اور حوا آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ وہ خاموش سنتا رہا

آدم ——— سب تعریف اللہ عزاسمہٗ کے لئے ہے۔ آج تم اُداس کیوں ہو؟

حوا ——— میری بائیں آنکھ پھڑکتی ہے۔ اللہ عزاسمہٗ اپنا فضل کرے۔ آج باغ کی ہوا کچھ بدلی ہوئی نظر آتی ہے

آدم ——— خوب یاد آیا۔ ابھی وادیٔ ایمن میں جبرئیل علیہ السلام تشریف لائے تھے اور انھوں نے اللہ عزاسمہٗ کی طرف سے خبر دی ہے کہ ابلیس لعین یعنی ایک راندہ ہوا فرشتہ بغیر اجازت کے باغ عدن میں داخل ہو گیا ہے اور عنقریب ہم دونوں کو بہکانے والا ہے۔ لہٰذا اللہ عزاسمہٗ نے ہدایت کی ہے کہ ابلیس لعین کے دھوکے میں نہ آئیں اور شجر ممنوع جو علم و روشنی کا درخت ہے اس سے ہمیشہ دور رہیں۔ کیونکہ اس درخت کا پھل کھانے سے ہم پر اللہ عزاسمہٗ کا غضب نازل ہوگا

حوا ——— سب تعریف اللہ عزاسمہٗ کے لئے ہے۔ ہم لوگ ہرگز خداوند عالم کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کریں گے اور ابلیس کے بہکانے میں نہیں آئیں گے

حوا گہرے سوچ میں پڑ گئی اور بیٹھے بیٹھے سو گئی۔ آدم باہر چلا گیا۔ ابلیس موقع پا کر اندر داخل ہوا۔ اور خواب میں حوا پر ظاہر ہوا

ابلیس ——— اے جنت کی رہنے والی۔ تو کیوں غفلت کی نیند میں پڑی ہے۔ کیا تو نے شجر علم کا پھل نہیں کھایا جو تیری غفلت کو دُور کر دے گا۔ اور تیری آنکھوں سے یک قلم جہل و نادانی کے پردے اٹھا دے گا

حوا ——— سب تعریف اللہ عزاسمہٗ کے لئے ہے۔ میں شجر علم کا پھل ہرگز نہیں کھاؤں گی۔ کیونکہ اللہ عزاسمہٗ نے وہ پھل چکھنے کی ممانعت کی ہے۔ اور میں اللہ عزاسمہٗ کی نافرمان نہیں ہوں۔ آج ہی جبرئیل علیہ السلام نے خداوند عالم کے حکم کی تجدید کی ہے۔ میں اُس پھل کے قریب نہیں جاؤں گی

ابلیس ——— اے نادان عورت۔ اے علم و دانش کے نور سے بے بہرہ نازنین۔ میں تجھے اور تیرے خاوند کو آگاہ کئے دیتا ہوں کہ تم دونوں سخت دھوکے میں ہو۔ تو جب تک علم کے درخت کا پھل نہیں کھائے گی تجھے کیونکر معلوم ہوگا کہ تیرا دوست کون ہے اور دشمن کون۔ سچ کیا ہے اور جھوٹ کیا۔ نادان عورت۔ علم ہی وہ نعمت ہے۔ جو کرۂ عالم کی تمام رحمتوں کا سرچشمہ ہے۔ خود جبرئیل بھی اس جنتی پھل کی لذت سے بے نصیب ہے۔ وہ بھلا تجھے اور تیرے خاوند کو کیا نیک مشورہ دے سکتا ہے۔ میں البتہ علم کے درخت کا پھل کھاتا ہوں اور تمام فرشتوں کا استاد ہوں۔ میرا لقب معلم الملکوت ہے۔ میں تجھے مشورہ دیتا ہوں کہ ضرور علم درخت کا میوہ کھایا کر اور اپنے خاوند کو کھلایا کر

حوا ——— تیرا کیا نام ہے ؟

ابلیس ——— ابلیس

حوا ——— لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ معاً حوا کی آنکھ کھُل گئی اور ابلیس اُس کی آنکھوں سے اوجھل ہو گیا

عدن کا ایک اور منظر

ابلیس حوا کے محل سے کوئی سو قدم پر گیا ہوگا کہ سامنے سے جبرئیل علیہ السلام نمودار ہوئے

جبرئیل ——— تو یہاں کیوں آیا ؟

ابلیس ——— تاکہ تیری کوتاہ فہمیوں کا پردہ فاش کر دوں

جبرئیل ——— تو یہاں کس کی اجازت سے آیا ؟

ابلیس ——— اجازت ۔ میرے لئے کسی کی اجازت ضروری نہیں ۔ اجازت تو صرف تیرے جیسی غلام روحوں کے لئے ہے ۔ میں خود اپنی اجازت سے آیا ہوں

جبرئیل ——— اچھا ۔ تو اب فوراً چلا جا ۔ ورنہ تجھے دردناک سزا دوں گا

ابلیس نے اپنا بے پناہ نیزہ اٹھایا اور قریب تھا کہ جبرئیل کے سینہ میں اُتار دے کہ اُس کا ہاتھ خود بخود شل ہو گیا ۔ دوسرے ہاتھ سے اُس نے تلوار اٹھانا چاہی ۔ مگر وہ ہاتھ بھی معطل ہو چکا تھا ۔ اُس کے سارے بدن پر فالج گر گیا ۔ جبرئیل نے اپنا عصا زور سے ابلیس کے سر پر مارا ۔ اور وہ شہاب ثاقب کی طرح لڑھکتا اور پٹخنیاں کھاتا ہوا باغ عدن سے نیچے گرا ۔ اور ساتوں آسمانوں سے ہوتا ہوا ۔ ایک لق و دق مقام پر پہونچا جسے زمین کہتے ہیں

اس مقام پر آدم و حوا بھی موجود تھے اور ان کے ہاتھوں میں علم و دانش کے دو روشن پھل تھے ۔ دونوں شرمانے لگے کیونکہ بالکل ننگے تھے ۔ اور رونے لگے کہ اپنی خطا پر نادم تھے اور ڈرنے لگے کہ خدا کا غضب قریب تھا

ابلیس ——— اے نادان انسانو ! ۔ نہ ڈرو ۔ نہ روؤ اور نہ شرماؤ ۔ میں تمہارے ساتھ ہوں اور تمہارے ساتھ رہوں گا ۔ کیا ہی مبارک ہیں وہ ہستیاں جو علم و دانش کا پھل ہاتھوں میں لئے ہیں

دفعتاً آسمان پھٹ گیا ۔ بجلیاں چمکیں ۔ ابلیس کی گردن میں لعنت کا طوق پڑ گیا ۔ اور وہ ایک رینگتا ہوا سانپ بنگیا اُس کی ذریات بھی اسی زمین پر آگئی ۔ اور ساری زمین پر تاریکی چھا گئی

محمد اسحاق (امرتسری)

ملکۂ نورجہاں تاریخ کی صحیح روشنی میں

اور

علی قلی استجلو کے قتل کا راز

"قوم و ملک کی تاریخ، گذشتہ واقعات کا آئینہ ہوا کرتی ہے، اور تاریخ کی تالیف کا مقصد بھی یہی ہے، کہ آنیوالی نسلیں گذشتہ دور کے صحیح و مستند واقعات سے باخبر ہوں۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں، کہ زیادہ تر تاریخیں کسی خاص مقصد کو پیش نظر رکھ کر لکھی جاتی ہیں، جب صورت حال یہ ہو، تو پھر کس طرح امید کی جاسکتی ہے، کہ تاریخ کی کتابوں میں جو واقعات درج ہیں۔ وہ واقعتاً صحیح بھی ہیں یا نہیں۔ اس بیسویں صدی میں مہذب قومیں نہایت فخر و مباہات کے ساتھ اس کا دعویٰ کرتی ہیں کہ انھوں نے فن تاریخ کو اتنی ترقی دیدی ہے کہ مُردہ قومیں آج زندہ ہوگئی ہیں

لیکن آج، جب کوئی انگریز اسلام کی تاریخ لکھنے بیٹھتا ہے تو اس کے قلم کا سارا زور اس میں صرف ہوتا ہے، کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلایا گیا۔ اسلام کے ماننے والے تنگ نظر اور متعصب ہوتے ہیں۔ اور بانیٔ مذہب (صلعم) کی شان میں اپنی ساری ہزیان گوئی و بکواس ختم کر دیتا ہے، اُس کی ساری تحقیق صرف اس لئے ہوتی ہے، کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کو دوسروں کی نظروں میں ذلیل و خوار دیکھیں

اسی طرح جب کوئی مسلمان یا ہندو، ہندوستان کی تاریخ لکھنے بیٹھتا ہے، تو وہ اپنی سب سے بڑی کامیابی، یا "تاریخ دانی" اسی میں سمجھتا ہے، کہ وہ ایسے واقعات ایک جا کر دے، جس سے خواہ مخواہ کا بھی آپس میں بغض و عناد پیدا ہوئے۔ جب کوئی ہندو عالم گیر، محمد تغلق، محمود، میر قاسم کے حالات پڑھتا ہے، اور یہ معلوم کرتا ہے کہ ان لوگوں نے ہندوؤں، اور ان کے مذہب پر، کس کس طرح کا ظلم کیا ہے، تو روادار سے روادار ہندو، کا دل بھی دُکھ جاتا ہے۔ اسی طرح جب کوئی مسلمان، سیواجی اور دوسرے ہندوؤں کے حالات پڑھتا ہے، تو اس کی "اسلامی رگوں" میں بھی خون دوڑنے لگتا ہے

ظاہر ہے، جب اس قسم کی تاریخیں ہمیں اسکولوں اور کالجوں میں پڑھائی جائیں گی، تو ملک کی فضا کا حال کیا ہوگا؟ یہ ایک نہایت اہم اور ضروری سوال ہے، جس پر ہمیں نہایت غور و فکر کے ساتھ تھوڑی دیر سوچنا چاہیئے۔ اندنوں میرے پیش نظر، رومیش دت سی، آئی، ای (Romesh Dutt C. I. E.) کی تاریخ (India under British Rule) ہے، رومیش بابو نے اپنی کتاب میں نہایت وضاحت سے یہ بتلانے کی کوشش کی ہے، کہ کس طرح انگریزوں نے ہندوستان کی تجارت، وصنعت وحرفت کو برباد کیا ہے۔ میرے خیال میں، بالکل اسی طرح انھوں نے ہندوستان کی تاریخ کو بھی مسخ کر ڈالا ہے۔ اسکول و کالج کے غریب لڑکوں کو، درسی کتابوں کے انبار سے اتنی فرصت کہاں رہتی ہے، کہ وہ ہر تاریخی واقعہ کی تحقیق کریں، کہ آیا یہ صحیح ہے یا غلط،

آج ہندوستان کی ذہنیت جو اس قدر خراب و پست ہے، ایک قوم دوسری سے دست و گریباں ہے، ایک کو ایک پر اعتماد و بھروسہ نہیں ہے، بلاشبہ اس کی سب سے بڑی وجہ "ہندوستان کی غلط تاریخ" ہے، ہم ان غلط تاریخوں میں صرف یہی نہیں پڑھتے ہیں، کہ ہندو یا مسلمان حکمراں متعصب و تنگ نظر تھا، بلکہ عیاش، نااہل و بزدل تھا۔ اس میں حکمرانی کی ذرا صلاحیت نہ تھی۔ اُس کا سارا وقت شراب و کباب، ناچ و گانے، میں صرف ہوتا تھا۔ پھر ان مشاغل سے اتنی فرصت کہاں ہوتی تھی، کہ وہ عنان حکومت کو سنبھالتا

میں نے تمہید میں بہت کچھ کہہ ڈالا ہے۔ میرا اصل موضوع شہنشاہ جہانگیر و ملکہ نورجہاں کے صحیح حالات کی تحقیق ہے۔ انگریز مؤرخوں نے جہانگیر کے متعلق وہ سب کچھ لکھ ڈالا ہے، جو ایک عیاش و بزدل، ناکارہ و نااہل، حکمراں کے متعلق کہا جا سکتا ہے۔ اور "حکمراں مؤرخ" کی پیروی، ہمارے ہندوستانی مؤرخوں نے بھی نہایت فراخ دلی سے کی ہے۔ ان کے مؤرخانہ دماغ نے ایک لمحہ کے لئے بھی یہ سوچنا گوارہ نہ کیا کہ جو کچھ وہ لکھ رہے ہیں، اُس کا کتنا حصہ صحیح ہے۔ لیکن برخلاف اس کے جب انگریز انگلستان کی تاریخ لکھتا ہے، تو اُسے اپنے حکمراں کی کوئی بُرائی نظر نہیں آتی، اور اگر واقعتاً کچھ ہوتی بھی ہے، تو اُس کو نہایت خوش اسلوبی سے نباہنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کی تاریخ نویسی کا سب سے بڑا اہم مقصد یہ ہوتا ہے، کہ وہ اپنی قوم و ملک کی تاریخ، بہترین نقش و نگار کے ساتھ پیش کرے، اس کی یہ کوشش ہوتی ہے۔ کہ اوس کے حکمراں کی سیرت نوجوانوں کے لئے (Ideal) کا کام دے۔ لیکن اگر کبھی غریب جہانگیر کے منہ سے یہ نکل گیا تھا کہ:-

"میں نے سلطنت نورجہاں بیگم کو بخشدی، مجھے ایک سیر شراب اور نیم سیر گوشت
کے سوا اور کچھ نہیں چاہیئے"

تو صرف اتنی سی بات پر، مؤرخوں کا قطعی فیصلہ ہوگیا، کہ جہانگیر شرابی اور عیاش تھا، اس کو امور سلطنت سے کسی قسم کا کوئی واسطہ اور لگاؤ نہ تھا۔ جو کچھ کرتی تھی وہ نورجہاں۔ سلطنت کی باگ اسی کے ہاتھ میں تھی، وہ جسے اور جس طرح چاہتی تھی موڑتی تھی

جو کچھ میں نے اس وقت تک کہا ہے، اوس کا مقصد صرف یہ بتانا ہے، کہ ہماری تاریخیں کس روشنی میں لکھی گئی ہیں، اور لکھی جا رہی ہیں۔ اُس کا اثر ہم پر کیا ہوا ہے، اور آئے دن ہو رہا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ ملک کی فضا مسموم ہو گئی ہے، ہماری ذہنیت خراب ہو گئی ہے۔ دل و دماغ معطل و ماؤف ہو گئے۔ صحیح و غلط واقعات کی تمیز جاتی رہی ہے آپس میں نفرت و حقارت کے جذبات بھڑک اٹھے ہیں

بہرکیف جہانگیر و نورجہاں کے متعلق بہت سے افسانے مشہور ہیں۔ اور یہ تمام کی تمام کہانیاں انگریز مورخوں کی خود ساختہ ہیں۔ میں اپنے اس مضمون میں حسب ذیل واقعات سے بحث کروں گا

(۱) جہانگیر و نورجہاں سے ملاقات کس طرح ہوئی،

(۲) کیا یہ صحیح ہے کہ جہانگیر نے شیر افگن کو محض اس لئے قتل کرایا تاکہ وہ نورجہاں کو حاصل کر سکے،

(۳) کیا یہ حقیقت ہے کہ جہانگیر میں حکومت کی صلاحیت مفقود تھی اور امور سلطنت کی ساری ذمہ داری نورجہاں پر تھی

جہانگیر کا صرف ایک مشغلہ ناچ و رنگ و شراب و کباب تھا

یہ اور اسی قسم کے بہت سے چھوٹے بڑے واقعات ہیں جن سے اس مضمون میں شرح و بسط کے ساتھ بحث کی جائے گی اور یہ بتلایا جائے گا کہ خود مؤرخین کے بیانات کس قدر غیر مربوط ہیں "

قبل اس کے کہ شیر افگن کے قتل، یا نورجہاں کے اثر و اقتدار کے متعلق کچھ کہا جائے، سب سے پہلے یہ معلوم ہو جانا چاہیے۔ کہ جہانگیر کی یہ فریفتگی کب سے شروع ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں جتنی تاریخیں بھی میری نظر سے گذری ہیں۔ تقریباً ہر ایک نے اس کو ایک نئے واقعہ سے شروع کیا ہے

منوچی لکھتا ہے کہ ایک روز جہانگیر ٹہل رہا تھا۔ اس کی نظر ایک نہایت سجی سجائی خوب صورت کشتی پر پڑتی ہے۔ اوس میں ..... ایک حسین و جمیل عورت کو بیٹھا ہوا دیکھ کر اوس سے ملنے کا خواہش مند ہوتا ہے۔ فوراً حکم دیتا ہے کہ لوگ بہترین تحائف لے کر کشتی میں جائیں، اور شاہزادے کی طرف سے اوس کو محل میں آنے کی دعوت دیں۔ مہرالنسا، جہانگیر کے تحفہ کو یہ کہتے ہوئے واپس کر دیتی ہے، کہ اوس کا شوہر زندہ ہے، اور اسے فخر ہے کہ حضور کے دربار کا ایک ادنیٰ ملازم ہے، اس کی زندگی میں اوس کا ایسا کرنا (یعنی شاہزادے کی طرف سے کسی تحفہ کا قبول کرنا، یا اس کی دعوت پر محل میں آنا) کسی طرح جائز نہیں سمجھتی، اور نیز وہ اوس کو برا سمجھتی ہے [1]

اس فاضل مؤرخ نے صرف یہی نہیں کیا ہے، کہ اوس نے سلیم کو اوباشوں اور بدمعاشوں کی صف میں لاکر کھڑا کر دیا ہے، بلکہ اوس نے مہرالنسا، کی عصمت کو بھی داغدار بنانے کی کوشش کی ہے۔ وہ یہ بتلانا چاہتا ہے کہ مہرالنسا ایک ادنیٰ درجہ کی عورت تھی، اوس کے پاس تحفہ تحائف نہایت آسانی سے پہونچ سکتے تھے

---

[1] تاریخ جہانگیر از منوچی صفحہ ۱۰۳

بدترین سے بدترین کریکٹر کے انسان سے بھی یہ جرأت ناممکن ہے کہ وہ اس طرح یک بیک کسی شریف عورت سے سلسلہ جنبانی شروع کردے۔ یہ سب کچھ مان لینے کے بعد بھی کہ سلیم شرابی تھا عیاش تھا کیا کوئی باوجود ان تمام برائیوں کے ایک منٹ کے لئے بھی یقین کرے گا کہ سلیم نے ایک شریف عورت کے ساتھ، جس کو وہ پہلے سے نہیں جانتا تھا، یا اگر جانتا ہوگا، تو دیکھا نہ تھا۔ ایسی ہمت کرے گا؟

اسی سلسلہ میں فاضل مؤرخ کا ایک جملہ نہایت قابل غور ہے آپ فرماتے ہیں:۔

"میرا شوہر زندہ ہے، اور دربار میں ایک ادنیٰ ملازم ہے، اس کی زندگی میں ایسا کرنا کسی طرح جائز نہیں سمجھتی" [1]

اس کے صاف معنی تو یہ ہوئے، کہ اگر شیر افگن مرجائے، یا ہار ڈالا جائے، تو مہرالنساء ہر طرح حاضر ہے۔ پھر آگے چل کر لکھتا ہے "بادشاہ فوراً خیر افگن کو لکھتا ہے، کہ وہ حکم نامہ پاتے ہی صوبہ دار سے ملے، اور صوبہ دار کو لکھدیا جاتا ہے کہ جب شیر افگن تمہارے پاس آئے، تو اس کو قتل کردو۔ شیر افگن قتل ہوتا ہے، لیکن اپنے ساتھ بہتوں کو قتل کرنے کے بعد

جو کچھ میں نے ابھی لکھا ہے، اوس کی پوری پوری تصدیق منوچی کے اُن سطور سے ہو جاتی ہے، اس کے صاف معنی تو یہ ہوئے کہ شیر افگن کا قتل مہرالنساء کی ایماء سے ہوا

اب آپ خود سوچ سکتے ہیں کہ قتل کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے؟ قاتل کون ہے؟ جہانگیر یا مہرالنساء؟

فاضل مؤرخ کی تاریخ دانی ابھی ختم نہیں ہوتی ہے، لکھتا ہے کہ شیر افگن کے قتل کے بعد، مہرالنساء سلیم کے حضور میں پیش کی جاتی ہے، لیکن مہرالنساء کی برہمی کا یہ حال تھا، کہ شادی بیاہ تو کجا اوس نے جہانگیر سے باتیں کرنے سے بھی قطعی انکار کردیا، اس طرح مہرالنساء کی خفگی میں ایک سال گذر جاتا ہے، سلیم چھپ چھپ کر اوس کے پاس جاتا ہے، لیکن اوس کی رسائی نہیں ہوتی! آخر ایک سال بعد چند شرائط کے ساتھ نکاح کے لئے راضی ہوتی ہے

شرائط:۔

(۱) بادشاہ کی تمام بیویوں پر اوس کو فوقیت حاصل ہو،

(۲) اس کا باپ اعتمادالدولہ بنایا جائے،

(۳) اوس کے بھائی اور دوسرے قرابت دار حکومت میں اعلیٰ عہدوں کے حقدار تصور کئے جائیں،

جب شیر افگن کا قتل خود مہرالنساء کی منشا اور ایماء کے مطابق ہوا تھا، تو پھر اس رنج و غصہ کے کیا معنی؟ ممکن ہے یہ کہا جائے کہ یہ مہرالنساء کا مکر اور اس کی عیاری تھی، تو پھر آخر اس کی ضرورت؟

---

[1] تاریخ مغلیہ از منوچی صفحہ ۷۷،

جب ایک سلطنت سے دوسری سلطنت میں شادی ہوتی ہے، یا ایک ریاست سے دوسری ریاست میں جب اس قسم کا کوئی رشتہ ہوتا ہے، تو بعض سیاسی مصالح کے لحاظ سے ایک دوسرے کی شرطیں منظور کرتے ہیں، لیکن یہاں کیا تھا؟ ایک شہنشاہ ایک معمولی عورت سے شادی کرتا ہے۔ پہلی شرط کہ اوسے تمام بیبیوں پر فوقیت حاصل ہو، حالانکہ یہ تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ نورجہاں حُسن و جمال میں سب میں ممتاز تھی، اگر یہ تمام واقعات صحیح ہیں، تو جہانگیر تو خود ہی مہرالنسا، کا دیوانہ و فریفتہ تھا۔ وہ بلا کسی عہد و پیماں کے بھی اوس کو اوروں سے زیادہ محبوب رکھتا

دوسری شرط یہ تھی کہ مہرالنسا، کا باپ اعتمادالدولہ بنایا جائے، حالانکہ وہ جہانگیر و مہرالنسار کے اس جدید رشتہ سے پہلے ہی اعتمادالدولہ کے خطاب سے ملقب ہو چکتا ہے [1] ظاہر ہے یہ دوسری شرط بھی کتنی مہمل بلکہ غلط ہے اور یہ تمام "شرائط" کس قدر لغو اور مضحکہ خیز ہیں، معلوم ایسا ہوتا ہے کہ فاضل مؤرخ نورجہاں کو جہانگیر کا سب سے زیادہ محبوب و منظور نظر دیکھ کر، اور غیاث بیگ کے اس طرح اعتماد کو دربار میں دیکھ کر، اور نیز آصف خاں کے اثر و اقتدار کو دیکھ کر، اوس نے یہ اندازہ لگایا، کہ ہو نہ ہو یہ سب کچھ کسی شرط ہی کے ماتحت ہوا ہوگا۔ اور ظاہر ہے یہ شرط نورجہاں نے اپنی شادی کے وقت جہانگیر سے کی ہوگی! یہ ہے ہمارے "فلسفی مؤرخ" کی جدت دماغ! کہاں سے کہاں جاکر کڑی ملاتا ہے!

مرزا غیاث بیگ اعتمادالدولہ کے متعلق پروفیسر بینی پرشاد اپنی کتاب میں لکھتے ہیں :-

> یہ فرض کر لینا نہایت سخت غلطی ہوگی غیاث بیگ اپنی بیٹی (نورجہاں) کے ہاتھوں میں کھلونا تھی۔ اوسی کے سالہا سال کے تجربات اس کا ذوق سلیم اوس کی صلاحیت و قابلیت ان تمام چیزوں نے مل کر اوسکو دربار شاہی کا ایک نہایت اہم رکن بنا دیا تھا [2]

آصف خان کے متعلق پروفیسر موصوف لکھتے ہیں :-

> وہ ایک زبردست محاسب تھا اور امور سلطنت کا بہترین سلیقہ رکھتا تھا [3]

باپ اور بیٹے کے باوجود ان گوناگوں خوبیوں کے جہانگیر پر یہ الزام کس طرح عائد ہو سکتا ہے۔ کہ اوس نے صرف نورجہاں کی خاطر یا منوچی کے خود ساختہ شرائط کے ڈر سے ان لوگوں کو اعلیٰ سے اعلیٰ عہدوں سے سرفراز کیا؟ اس وقت تک منوچی کے متعلق جو کچھ کہا گیا اوس سے نہایت آسانی کے ساتھ دوسرے "مورخین" کا بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے

ڈو (Dow) ایک مزے کی بات لکھتا ہے کہ :-

> سلیم ایک روز غیاث بیگ کے یہاں دعوت میں گیا ہوا تھا۔ اخیر میں جب سب لوگ رخصت ہو گئے اور صرف چند مخصوص مہمان باقی رہ گئے (جن میں ایک سلیم بھی تھا) تو غیاث بیگ نے مہرالنسا، کو

---

[1] اقبالنامہ جہانگیری صفحہ ۳۷ [2] ایضاً صفحہ ۱۸۸ [3] ایضاً صفحہ ۱۸۹

جو فن موسیقی میں یکتا تھی) بلایا، مہرالنساء نے خوب خوب اپنا ہنر دکھلایا، اور کچھ اس طرح پر "ناچی اور گائی" کہ اوروں کا تو معلوم نہیں کیا حال ہوا۔ سلیم پر معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے سحر کر دیا ہے۔ وہ خود رفتہ اور مبہوت ہو رہا تھا، پہروں کچھ نہ سمجھ سکا کہ وہ کہاں ہے اور کیا دیکھ رہا ہے، مہرالنساء اور سلیم کی "محبت" یہیں سے شروع ہوتی ہے

سب سے پہلے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اوس زمانہ میں ایسا دستور تھا کہ شریف زادیاں آج کل کے یورپ کی شریف زادیوں کی طرح عیش و نشاط کی محفلوں میں آکر گایا اور ناچا کرتی تھیں؟ اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ اوس وقت شریف گھرانوں میں موسیقی کا چرچا ہو ظاہر ہے شریف لڑکیاں گانا یا ناچنا نہیں سکھائی جاتی تھیں۔ تو پھر یہ سوال کیا جا سکتا ہے۔ کہ آخر اس فاضل مورخ نے یہ لکھا کس طرح، معلوم ایسا ہوتا ہے کہ سلیم غیاث بیگ کے یہاں اکثر جایا کرتا ہوگا۔ اس طرح اس کو کبھی مہرالنساء کو دیکھ لینے کا موقع مل گیا ہوگا رٹچی (Ritchie) لکھتا ہے:-

قبل اس کے کہ نورجہاں اپنے باپ (غیاث بیگ) کا تعارف سلیم سے کرائے وہ خود اپنی ذاتی قابلیت و لیاقت سے اکبر کے دربار میں عزت و وقار کی جگہ حاصل کر چکا تھا۔ یہاں تک کہ خود سلیم اوس کے یہاں مدعو ہو کر جایا کرتا تھا [1]

اب بالکل واضح ہو گیا کہ سلیم اکثر و بیشتر غیاث بیگ کے یہاں مہمان بنکر جایا کرتا تھا۔ اس لئے بہت ممکن ہے کہ اوس نے آتے جاتے ہوئے کبھی مہرالنساء کو دیکھ لیا ہو اور یہ ایک لگتی ہوئی بات بھی معلوم ہوتی ہے

مہرالنساء اور سلیم کی ملاقات کے متعلق جو سب سے زیادہ مشہور روایت ہے وہ یہ کہ مہرالنساء اپنی ماں کے ساتھ اکثر محل میں آیا کرتی تھی اس طرح سلیم کو اکثر اس کے دیکھنے اور اس سے ملنے کا موقع مل جاتا تھا [2]

اس قسم کی ملاقات کا واقعہ انارکلی کے متعلق بھی مشہور ہے، اور انارکلی کی موت کا سبب یہ بتایا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ اکبر نے خود سلیم اور انارکلی کو اشاروں میں باتیں کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اور سلیم اور انارکلی کی اس گستاخی کو وہ برداشت نہ کر سکا اور فوراً انارکلی کے سنگسار کا حکم دے دیا

درحقیقت اس قسم کے واقعات شاہی حرم کو بدنام کرنے کے لئے مورخین نے گڑھے ہیں۔ وہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ شاہزادے ایسے بدکار اور بداطوار ہوا کرتے تھے کہ شریف بہو بیٹیوں کا شاہی محل میں آنا مشکل تھا۔ بلا کسی ادنیٰ و اعلیٰ شریف و رذیل کی تمیز کے جو آئی اس پر آنکھ گڑ گئی۔ بلاشبہ شاہزادے بے باک و آزاد ہوا کرتے تھے، لیکن اتنا نہیں جتنا ہمارے یہ مورخین رنگ و روغن کے

---

[1] صفحہ ۶ [2] الفنسٹن (Elphinstone) صفحہ ۲۴۳ بعض مورخین کا یہ خیال ہے۔ کہ مہرالنساء کی ماں ہندوستان نہیں آئی تھی بلکہ یہاں آتے ہوئے راہ میں اوس کا انتقال ہو گیا تھا

ساتھ دکھلاتے ہیں۔ باوجود ان تمام برائیوں کے جو بادشاہ و شاہزادے اور شاہی محل کے متعلق مشہور ہیں۔ شریف بہو بیٹیوں کی عصمت و شرافت ہمیشہ محفوظ رہا کرتی تھی

انگلستان کے ایک مشہور ناول نویس (Renold) کا یہ جملہ نہایت عبرت انگیز ہے :-

" تعظیم و احترام میں اپنی ماں اور ملکہ معظمہ کو معصوم سمجھتا ہوں "

جہاں خود یہ حال ہو وہاں اون مورخین کا مسلمان بادشاہوں کی عیش و نشاط کی محفلوں کے ان افسانے کو سُن سُن کر اُن کے دماغی توازن کا کیا حال رہا ہوگا۔ خود اندازہ کیجئے !!

Petro Della Vella ، لکھتا ہے :-

اوس کے (مہرالنسا) شوہر کے انتقال کے بعد سلیم نے اوس کو دیکھا تھا، اور اسی وقت سے وہ اوس سے محبت کرنے لگا [1]

اب تک جتنے واقعات بھی میں نے لکھے ہیں۔ اور جو کچھ نورجہاں اور جہانگیر کے متعلق مشہور ہے اس میں یہ سب سے زیادہ عجیب ہے۔ حالانکہ اگر ہم اس کو تاریخی واقعات کی روشنی میں دیکھیں تو اتنا "عجیب" نہ معلوم ہوگا اب یہ معلوم کرنے کے لئے کہ حقیقت و اصلیت کیا ہے۔ شیر افگن کے متعلق جو کہانیاں مشہور ہیں عقل کی روشنی میں جانچنا ہوگا۔ اس کے بعد پھر ہم نہایت آسانی سے معلوم کرلیں گے کہ مہرالنسا کو سلیم نے کب دیکھا۔ اور شیر افگن کے قتل کی اصلی وجہ کیا ہے ؟

عام طور پر شیر افگن کے قتل کے متعلق جو واقعہ مشہور ہے، اور جس سے ہماری تاریخیں بھری پڑی ہیں۔ وہ یہ کہ سلیم مہرالنسا سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ لیکن چونکہ اکبر نے انکار کردیا۔ اور بجائے سلیم کے اس کی شادی شیر افگن سے کردی گئی [1]

کنیڈی (Kannady) لکھتا ہے :-

جہانگیر تخت نشین ہوتے ہی صوبہ دار کو یہ ہدایت بھیجتا ہے کہ مہرالنسا کو شیر افگن سے طلاق دلوادو اور اسکو (مہرالنسا) دربار میں بھیجدو، لیکن شوہر (شیر افگن) نے اعتراض کیا، اور اسکا یہ اعتراض جائز تھا۔ ایک ملاقات کے دوران میں اس نے صوبہ دار کے پیٹ میں چھری بھونکدی اور خود بھی چھری بھونکر مرگیا، اب مہرالنسا دربار میں بھیجدی گئی لیکن اس نے جہانگیر سے کسی قسم کا تعلق پیدا کرنے سے صاف انکار کردیا۔ کیونکہ وہ خوب جانتی تھی کہ جہانگیر اس کے شوہر کا قاتل ہے اور اسکا یہ خیال حق بجانب تھا [2]

الفنسٹن (Elphinston) بھی صرف الفاظ کی الٹ پھیر کے ساتھ تقریباً سب کچھ یہی لکھتا ہے —

---

[1] ڈو (Dow) صفحہ ۲۴ و ۲۵ [2] کنیڈی جلد دوم صفحہ ۱۷

ہولڈن (Holdan) لکھتا ہے کہ :-

جہانگیر قطب الدین کو بنگال کا گورنر بنا کر بھیجتا ہے، اور تاکید کرتا ہے کہ وہ شیر افگن کو مجبور کرے کہ وہ مہرالنساء کو طلاق دیدے۔ اور اسکو گورنر کے حوالہ کرے تاکہ وہ دربار میں بھیجدی جائے" لیکن پھر خود ہی ہولڈن کہتا ہے کہ " لیکن ان تمام باتوں کی کوئی تفصیل نہیں " [1]

سر تھامس رو (Sir Thomas Roe) نے نورجہاں کے اقتدار اور جہانگیر پر اس کے اثر کے متعلق نہایت زوردار الفاظ میں لکھا ہے لیکن شیر افگن کے قتل کے متعلق اس نے ایک لفظ بھی نہیں لکھا [2]

ایڈورڈ ٹیری (Edward Terry) جس نے ۱۶۱۶ء سے ۱۶۱۹ء یعنی مسلسل تین سال تک ہندوستان کی سیاحت کی تھی، وہ اپنے سفرنامے میں ہندوستان کے متعلق وہ سب کچھ لکھتا ہے جو ایک سفرنامہ میں ہونی چاہیئے۔ اس نے مذہب یہاں کے لوگوں کے عادات، واطوار، امراء کے لباس، حکومت کی دفتری زبان، ہندوستانی آبادی ورقبہ، کے متعلق نہایت تفصیل سے بتانے کی کوشش کی ہے، لیکن اوس نے ایک لفظ بھی جہانگیر اور نورجہاں کے مشہور زمانہ افسانہ کے متعلق نہیں لکھا حالانکہ صرف پانچ برس قبل یعنی ۱۶۱۱ء [3]

جہانگیر اور مہرالنساء کی شادی ہوئی تھی وہ ایک پرمہرالنساء کا ذکر خاص طور پر کرتا ہے، لکھتا ہے :-

نورمحل جہانگیر کی محبوب ترین ملکہ تھی اس نے اپنی ذاتی خوبیوں کی وجہ سے بہتوں کو اپنا دوست بنالیا تھا [4]

اس سیاح نے شیر افگن کے قتل یا طلاق کا مطلقاً کوئی تذکرہ نہیں کیا ہے۔ حالانکہ اس سہ سالہ قیام کے دوران میں یہ "رازکی باتیں" اس کو معلوم ہوجانی چاہیئے تھیں۔ لیکن اب دیکھنا یہ ہے۔ کہ واقعتاً جہانگیر اس قدر ذلیل و اوباش تھا کہ وہ کسی شریف کو اس طرح مجبور کرے گا کہ وہ اپنی بیوی کو صرف اس کے ہوا و ہوس کو پورا کرنے کے لئے طلاق دیدے، جہانگیر کے کیریکٹر کو بغور مطالعہ کرنے والے بخوبی جانتے ہیں۔ کہ وہ شرابی تھا، رقص وسرود کی محفلوں میں شریک ہوتا تھا، اوس سے لطف اندوز ہوتا تھا عیش وعشرت کا دلدادہ تھا۔ زاہد خشک نہ تھا۔ تو اس کے کیا معنی کہ وہ رذالت پر اتر آیا تھا ؟

جہانگیر کو آخر اس کی کیا ضرورت پڑی تھی کہ وہ شیر افگن کو طلاق کے لئے مجبور کرے، حالانکہ اوس کے لئے کوئی بڑی بات نہ تھی کہ وہ بلا طلاق دلوائے ہوئے بھی مہرالنساء کو حاصل کرتا، اور شرعاً تو کسی کو طلاق کے لئے مجبور کرنا بھی تو جائز نہیں ہے!

(باقی) شاہ محمد زبیر (زبیری)

---

[1] تاریخ ہندوستان از ہولڈن (Holdan) صفحہ ۴۴۳

[2] جہانگیر از پروفیسر بینی پرشاد صفحہ ۱۳۲

[3] (Early travel by Foster) صفحہ ۳۳۹

بابُ الانتقاد

جگر کے سو شعر

یہ مختصر سا رسالہ بھی (اصغر کے سو شعر کی طرح) جامعہ ملیہ نے شائع کیا ہے اور محمود علی خاں صاحب اس کے بھی مرتب ہیں۔ شروع کے چند صفحات میں جگر کے سوانح زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے اور اسی سلسلہ میں ان کی خصوصیات شعری کو بھی ظاہر کیا گیا ہے

انتخاب کنندہ نے جگر کے کلام کو تین ادوار میں تقسیم کیا ہے ایک وہ جو مجاز کی شاعری کے لئے مخصوص تھا، دوسرا وہ جب جگر کسی کے مُرید ہوکر "بلند خیالات بلند الفاظ میں" لکھنے لگے اور تیسرا دور حاضر جب "بلند خیالات سادہ الفاظ میں" نظر آتے ہیں۔ گویا بالفاظ دیگر یوں سمجھنا چاہیئے کہ پہلے جگر صرف اُن جذباتِ محبت کو ظاہر کرتے تھے جن کا تعلق اس دُنیا کے عشق و محبت سے ہے اور اب وہ اس دنیا سے گزر کر کسی اور دنیا کی باتیں کرتے ہیں جن کا دوسرا نام انتخاب کنندہ کی زبان میں تصوف و حکمت وغیرہ خدا جانے کیا کیا ہے

گزشتہ ماہ کی اشاعت میں ہم "اصغر کے سو شعر" پر تنقید کرتے ہوئے تصوف و تغزل کے باہمی تعلق پر کافی بحث کر چکے ہیں اس لئے اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں، لیکن جس حد تک جگر کی شاعری کا تعلق ہے، یہ فیصلہ کرنا ضروری ہے۔ کہ ان کی شاعری محمود علی خاں صاحب کے اصولِ انتخاب پر یا ان کا اصول انتخاب جگر کی شاعری پر منطبق ہوتا ہے یا نہیں

چونکہ انتخاب کنندہ نے انتخاب میں اس کا لحاظ نہیں رکھا کہ ہر دَور کی شاعری کے نمونے علٰحدہ علٰحدہ یکجا جمع کر دیے جائے اس لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ انھوں نے کس شعر کو کس رنگ کا سمجھ کر انتخاب کیا ہے، تاہم ایک عمومی تبصرہ کے سلسلہ میں بھی یہ حقیقت پوشیدہ نہیں رہ سکتی کہ انتخاب کنندہ نے کس شعر کو اپنے کس ذوق کے ماتحت پسند کیا ہے

جگر کے دَور اول کی شاعری کے جو نمونے انھوں نے پیش کئے ہیں ان میں غالباً حسب ذیل قسم کے اشعار شامل ہونگے:۔

سب اُن پہ ہیں تصدق وہ سامنے تو آئیں — اشکوں کی آرزوئیں آنکھوں کی التجائیں

(مجھ ناتوانِ عشق کو سمجھا ہے تم نے کیا — دامن پکڑ لیا تو چھڑایا نہ جائے گا)

مجھے دے رہے ہیں تسلیاں وہ ہر ایک تازہ پیام سے کبھی آ کے منظرِ عام پہ کبھی ہٹ کے منظرِ عام سے

دوسرا دَور جس میں بقول محمود علی خاں صاحب " بلند خیالات بلند الفاظ میں " ظاہر کئے گئے ہیں اور جو اُن کے نزدیک تصوف کا رنگ لئے ہوئے ہیں غالباً ذیل کے اشعار سے متعلق ہوگا :۔

مجھے تلاش کرا ے بیخودی شوق سجود بہو یخ کے منزلِ مقصد پہ کھو گیا ہوں میں
(فریب خوردۂ رنگینیٔ ادا ہوں میں نظر کی چند شعاعوں میں گھر گیا ہوں میں)
میری حیرت کی قسم آپ اٹھائیں تو نقاب میرا ذمہ ہے کہ جلوے نہ پریشاں ہونگے
گو سراپا حجاب ہیں پھر بھی تیرے رُخ کے نقاب ہیں ہلکے
تو سامنے ہے پھر بھی بتلا کہ تو کہاں ہے کس طرح تجھ کو دیکھوں نظارہ درمیاں ہے
تمام اٹھ گئے پردے تو اس سے کیا حاصل مزہ تو جب تھا کہ میں بھی نہ درمیاں ہوتا
فطرتِ مجبور پر قابو ہی کچھ چلتا نہیں ورنہ ہم تو تجھ سے بھی تجھ کو چھپا کر دیکھتے
حُسن تک دیکھ لیں سب حُسن کے جلوؤں کی بہار مجھ تک آئے تو مرا حالِ پریشاں ہونگے
ٹھہر اے دل دردمند محبت تصورِ کسی کا پریشان ہوگا

تیسرا دَور جس کے متعلق انتخاب کنندہ نے لکھا ہے کہ " بلند خیالات سادہ الفاظ میں " ظاہر کئے ہیں دَور اوّل سے علٰحدہ ہم کو کہیں نظر نہیں آیا۔ ممکن ہے دَورِ ثانی کے بعض ایسے اشعار جو جلد سمجھ میں آجاتے ہیں اور جن کی تاویل کی ضرورت نہیں ہوتی ، انھوں نے دَورِ ثالث سے متعلق کر دیے ہوں

بہرحال انتخاب جس اصول کو بھی سامنے رکھ کر کیا گیا ہو ، اس میں شک نہیں کہ جگر کے کلام میں دو رنگ بالکل علٰحدہ علٰحدہ نظر آتے ہیں جن کی تقسیم انتخاب کنندہ نے مجاز و حقیقت کی ہے اور ہمارے نزدیک اس کی تقسیم صرف یوں ہونی چاہیئے کہ ایک دور کا کلام واقعی تغزل کے صحیح معیار پر اُترتا ہے اور دوسرا اس سے ہٹا ہوا ہے ، یعنی اگر سو شعرا نھوں نے ایسے کہے ہیں جن سے وجدانِ صحیح بغیر کسی تاویل و کاوش کے لطف اندوز ہو سکتا ہے تو دس ایسے بھی نظر آتے ہیں۔ جو مشاعروں میں تو زیادہ سے زیادہ داد حاصل کرتے ہیں لیکن یوں اگر تنقید کی جائے تو وہ سوائے چند خوبصورت الفاظ و تراکیب کے مجموعہ کے اور کچھ نہیں ٹھیرتے۔ چنانچہ قسم دوم کے جو اشعار اوپر درج کئے گئے ہیں وہ سب اسی انداز کے ہیں

فریب خوردۂ رنگینیٔ ادا ہوں میں نظر کی چند شعاعوں میں گھر گیا ہوں میں

اگر دوسرے مصرعہ میں نظر سے مُراد اپنی نظر ہے تو مفہوم کی خافت ظاہر ہے کیونکہ اس طرح مطلب یہ پیدا ہوتا ہے کہ محبوب کی خوش ادائیاں صرف اپنی نظر کا فریب ہے ورنہ حقیقت کچھ نہیں ، لیکن اگر یہ چند شعاعیں محبوب کی نگاہ کی ہیں تو پھر دونوں مصرعے غیر مربوط رہتے ہیں کیونکہ معشوق کی نگاہ رنگینیِ ادا کا فریب پیدا کرنے والی نہیں

میری حیرت کی قسم آپ اٹھائیں تو نقاب میرا ذمہ ہے کہ جلوے نہ پریشاں ہوں گے

اس شعر میں صرف لفظ پریشاں پر مفہوم کی بنیاد قائم کی گئی ہے جو لکھنوی اندازِ بیان کے لحاظ سے ممکن ہے بعض لوگوں کو اپیل کر سکے لیکن حقیقت کے لحاظ سے کچھ نہیں ہے

مدعا صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ آپ نقاب اٹھا دیں گے تو بھی میں فرطِ حیرت سے آپ کا نظارہ نہ کر سکوں گا، خیال اچھا ہے لیکن "جلوے نہ پریشاں ہوں گے" کہہ کر اس کو بُری طرح ادا کیا گیا ہے

اسی قسم کی تعبیر کا یہ شعر بھی ہے :-

ٹھہرا اے دل دردمندِ محبت تصوّر کسی کا پریشاں ہو گا

غزل میں شعر کی خوبی یہ ہے کہ بغیر کسی تصنع کے جذبات کا اظہار ہو جائے اور تصوفانہ رنگِ تعبیر میں یہی بات مفقود ہوتی ہے۔ بلکہ اگر غلو سے کام لیا جائے تو شعر مہمل ہو جاتا ہے۔ مثلاً

گو سراپا حجاب ہیں پھر بھی تیرے رُخ کی نقاب ہیں ہلوگ

تاویل اور کھینچ تان کا ذکر نہیں کہ وہ تو چرکین کے کلام کو بھی سرتاسر تصوّف و حکمت ثابت کر سکتا ہے، یوں دیکھئے کہ اس سے کوئی مفہوم پیدا ہوتا ہے یا نہیں،

غالب کا مشہور شعر ہے :-

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

غالب تو خیر یہ شعر کہنے کو کہہ گیا لیکن اس کے بعد شعراء نے اس سے جس قدر ناجائز فائدہ اٹھایا اس کا بیان بہت دردناک ہے، جگر کے یہاں بھی اسی فلسفۂ "ہوّیت" کے بعض انتخابات ملاحظہ ہوں

تو سامنے ہے پھر بھی بتلا کہ تو کہاں ہے کس طرح تجھ کو دیکھوں نظارہ درمیاں ہے

تمام اُٹھ گئے پردے تو اس سے کیا حاصل مزہ تو جب تھا کہ میں بھی نہ درمیاں ہوتا

نظارہ کا درمیان آکر حجاب بن جانا، یا خود دیکھنے والے کا بھی "درمیاں" نہ ہونا، حقیقتاً کوئی مفہوم نہیں رکھتا اسی طرح غالب کے اس مصرعہ نے

میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

لوگوں کو ایسے خیال کی طرف مائل کر دیا جس کا غلو یقیناً گمراہ کُن ہے۔ جگر لکھتے ہیں

فطرت مجبور پر قابو ہی کچھ چلتا نہیں ورنہ ہم تو تجھ سے بھی تجھ کو چھپا کر دیکھتے

دوسرا مصرعہ اپنے اندر کوئی معنی نہیں رکھتا

الغرض جگر کے کلام کا وہ حصہ جو انتخاب کنندہ کی رائے میں "بلند خیالات" سے متعلق ہے ہمارے نزدیک جگر

کے لئے قابل فخر نہیں ہو سکتا ، لیکن اس رنگ سے ہٹ کر جو کچھ انھوں نے کہا ہے اس میں شک نہیں کہ وہ بالکل معیاری چیز ہے اور اس وقت کا بہتر سے بہتر شاعر ان پر ناز کر سکتا ہے ، مثالاً یہ اشعار ملاحظہ ہوں :-

ہنسی پھر اُڑانے لگی عشق کے فسانے کی — نقاب اٹھاؤ بدل دو فضا زمانے کی
گوش مشتاق کی کیا بات ہے اللہ اللہ — سُن رہا ہوں میں وہ نغمہ جو ابھی ساز میں ہے
قفس کے سامنے بجلی کچھ اس طرح چمکی — نظر میں پھر گئی تصویر آشیانے کی
کہاں میں اور کہاں اب فسانۂ غم عشق — وہ التفات نہ کرتے تو کچھ بیاں ہوتا
لیکے خط ان کا کیا ضبط بہت کچھ لیکن — تھرتھراتے ہوئے ہاتھوں نے بھرم کھولدیا
ہائے یہ حُسن تصوّر کا فریب رنگ و بو — میں یہ سمجھا جیسے وہ جان بہار آہی گیا
(یہ نشہ بھی کیا نشہ ہے کہتے ہیں جسے حُسن — جب دیکھئے اک نیند سی آنکھوں میں بھری ہے)

جگر کی وہ خصوصیت جو اس دَور کے دوسرے خوشگو شعراء سے اُن کو ممتاز کرتی ہے " ولولہ و جوش " ہے یعنی اُن کے جذبات محبت تشاؤم و قنوط کی طرف مائل نہیں ہیں ، بلکہ ان میں ایک خوددارانہ ربودگی پائی جاتی ہے ، ایک خاص قسم کا احساس مطمئن نظر آتا ہے ۔ اور اسی لئے ان کی شاعری لکھنؤ اور دہلی دونوں اسکولوں سے قدرے علیحدہ ہے ۔ جو ان کے پہلے اُستاد داغ اور دوسرے اُستاد تسلیم کے رنگ کے امتزاج سے مل کر پیدا ہوئی ہے ۔ ممکن ہے اُن کے کلام میں فلسفۂ حیات کے وہ نکات بھی پائے جاتے ہوں جو عشق و محبت کی دنیا میں انتہائے استغراق کے بعد ایک بے نیازانہ کیفیت سے تعلق رکھتے ہیں ، اور معنی آفرینی و نُدرت تعبیر کے لحاظ سے بھی قابل لحاظ ہوا کرتے ہیں ، لیکن ان کا غالب رنگ وہی ہے ، جس میں کامیاب عشق و محبت کا جوش و ولولہ پایا جاتا ہے اور جو اس نوع کی رنگینیوں سے مالا مال ہے مگر افسوس ہے کہ اس مجموعۂ انتخاب میں جگر کے اس حقیقی رنگ کے شعر بھی بہت کم نظر آتے ہیں ۔ ان کی وہ غزل جس کا مطلع یہ ہے :-

وہ کب کے آئے بھی اور گئے بھی نظر میں اب تک سما رہے ہیں
یہ چل رہے ہیں وہ پھر رہے ہیں ، یہ آرہے ہیں وہ جا رہے ہیں

جگر کی شاعری کی سچی تصویر ہے ۔ اسی غزل کا ایک اور شعر بھی انتخاب میں نظر آتا ہے :-

وہی قیامت ہے قد بالا وہی ہے صورت ، وہی سراپا
لبوں کو جنبش ، نگہ کو لرزش ، کھڑے ہیں اور مسکرا رہے ہیں

جگر اپنی طبیعت و فطرت کے لحاظ سے بہت لاابالی واقع ہوئے ہیں ۔ اور غالباً یہی سبب ہے کہ وہ اپنی غزلوں پر تنقیدی نگاہ ڈالنے کی تکلیف بھی کم گوارا کرتے ہیں ۔ اُن کا ایک شعر ہے :-

ایک تجلی ، ایک تبسم ، ایک نگاہِ بندہ نواز — اس سے زیادہ اے غمِ جاناں دل کی قیمت کیا کہئے

پہلے مصرعہ میں " تجلّی، تبسّم، نگاہ " کو بغیر کسی حرف عطف کے اس طرح یکجا کر دیا گیا ہے کہ " دل کی قیمت " یہ تینوں چیزیں قرار پاتی ہیں، درانحالیکہ مقصود یہ ہے کہ اُن میں سے کوئی ایک کافی ہے۔ علاوہ اس کے " ایک تجلی " کہنا ذوق پر ناگوار بار ہے، اگر پہلا مصرعہ یوں ہوتا :-

ایک تبسّم، ایک جھلک، یا ایک نگاہِ بندہ نواز

تو دونوں نقص دُور ہو جاتے

دوسرے مصرعہ میں " غم جاناں " سے خطاب کرنا بھی بے محل ہے۔ اگر براہِ راست " جاناں " سے خطاب کیا جاتا تو شعر زیادہ لطیف ہو جاتا

ایک اور شعر ہے :-

ظلم کیا اب تو کرم بھی ہے گوارا مجھ کو
تیری اس اشک بھری چشمِ ندامت کی قسم

اس شعر کی بُنیاد یہ خیال ہے کہ محبوب کا کرم اس کے ظلم سے زیادہ تباہ کرنے والا ہے، یعنی لُطف و محبت کی ستم آرائیاں بہت زیادہ ہلاکت آفریں ہیں۔ یہ خیال بجائے خود اس میں شک نہیں کہ بہت لطیف ہے، لیکن دوسرا مصرعہ اس خیال سے علٰحدہ ہو کر موزوں ہو گیا ہے

صورتِ حال یہ ہے کہ محبوب سامنے موجود ہے اور اپنی اشک آلود نگاہوں سے اظہارِ ندامت کر رہا ہے۔ یعنی اس کی یہ کیفیت لُطف و عنایت کا اظہار کرنے والی ہے۔ اس لئے پہلے مصرعہ میں اس کو بہ لحاظ حقیقت ظلم نہیں کہہ سکتے۔ یہ مصرعہ یوں ہونا چاہیئے تھا

لُطف کیا اب تو ستم بھی ہے گوارا مجھ کو

کیونکہ ستم کرنے کے بعد محبوب پھر اس کی تلافی اپنی ندامت سے کرے گا جو عاشق کی عین مراد ہے

ایک شعر اور ہے :-

مجھے تلاش کرا ے بیخودی شوقِ سجود
پہونچ کے منزلِ مقصد پہ کھو گیا ہوں میں

دوسرے مصرعہ میں " منزلِ مقصد " کی ترکیب محل نظر ہے، کیونکہ دونوں لفظ " ظرفیت " کا مفہوم رکھتے ہیں اسی لئے منزل کی اضافت ہمیشہ مقصود یا کسی دوسرے ایسے لفظ سے کی جاتی ہے جو ظرفیت کے مفہوم سے علٰحدہ ہو

نگاہِ دل بھی یکایک اسے سمجھ نہ سکی
وہ ہر کرم جو پسِ پردۂ عتاب ہوا

اس شعر میں لفظ نگاہ کوئی معنی نہیں دیتا صرف مصرعہ پورا کرنے کے لئے لایا گیا ہے یوں کہہ سکتے تھے

غضب ہے، دل بھی یکایک اسے سمجھ نہ سکا

یہاں "غضب ہے" کا استعمال صرف اظہار حیرت واستعجاب کے لئے ہوا ہے۔

(اٹھانہ دیدۂ بلبل سے پردۂ حیرت
ہلاک ہوگئی کمبخت رنگ وبو کے لئے)

اس شعر کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ " بلبل رنگ وبو کے لئے ہلاک ہوگئی پھر بھی پردۂ حیرت نہ اٹھا " دوسرا یہ کہ " دیدۂ بلبل سے پردۂ حیرت نہ اٹھا یہاں تک کہ رنگ وبو کے لئے ہلاک ہوگئی " لیکن ان میں سے کسی مفہوم کے لحاظ سے پردۂ حیرت مناسب نہیں۔ اگر کسی طرح " پردۂ فریب نظر " لاکر مصرعہ ترتیب دیا جاتا تو بیشک " ہلاک ہوگئی کمبخت " کا پورا لطف آسکتا تھا

(انھیں آنسو سمجھ کر یوں نہ مٹی میں ملا ظالم
پیام درد دل ہے اور آنکھوں کی زبانی ہے)

چونکہ پیام واحد ہے اس لئے پہلے مصرعہ میں بجائے انھیں کے اِسے لکھنا زیادہ موزوں ہوتا۔ بعض بعض جگہ ترکیبوں میں تانانوس نقص بھی پایا جاتا ہے۔ مثلاً

بھرم کھونا کہیں اے دل نہ عشقِ معتبر ہوکر
یا شروعِ راہِ محبت ارے معاذ اللہ
یا یہ کیا کیا کہ عطا کرکے عشق لامحدود

عشقِ معتبر، شروعِ راہِ محبت اور عشقِ لامحدود، ثقیل ترکیبیں ہیں

الغرض جگر کے سو شعر کا انتخاب بھی غلط کیا گیا ہے اور بہت سے ایسے اشعار جو لینا چاہئے تھے انھیں ترک کر دیا گیا ہے اور جو قابل ترک تھے انھیں لے لیا گیا ہے۔ ورنہ اگر جگر کے کلام کا بالاستیعاب مطالعہ کیا جائے تو سو سے کہیں زیادہ اشعار بہترین رنگ تغزل کے ان کے یہاں میسر آسکتے تھے،

سنا ہے کہ حسرت وفانی وغیرہ کے کلام کا انتخاب شائع ہونے والا ہے۔ اگر انتخاب کرنے والے یہی صاحب ہیں تو ہم کو ابھی سے مایوس ہو جانا چاہئے ——— میری رائے میں انتخاب کی بہترین صورت یہی ہے کہ یہ خدمت خود اسی کے سپرد کی جائے جسکا کلام ہے، اس سے دو فائدہ مترتب ہونگے۔ ایک تو یہ کہ دنیا کو اسکے حقیقی رنگ کا پتہ چل جائے گا۔ اور دوسرے یہ کہ مستقبل میں کسی وقت اس انتخاب کی تاریخی وقعت بہت بڑھ جائے گی

نیاز

بابُ الاستفسار

زلزلہ کے اسباب

(طبقات الارض اور جوتش کے نقطۂ نظر سے)

(جناب محمد عبدالغنی صاحب۔ سارن)

زلزلہ کیا چیز ہے اور اس کے اسباب کیا ہیں۔ کسی ایک حصۂ زمین پر زیادہ جھٹکے محسوس ہونا اور دوسری جگہ کم یا بالکل نہیں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ کیا جوتشیوں کا یہ کہنا کہ سات سیارے ایک جگہ جمع ہو گئے تھے اور یہ تباہیاں اسی کی وجہ سے ہوئیں، کسی حد تک درست ہو سکتا ہے۔ اُمید ہے کہ آپ اس طرف جلد از جلد توجہ فرمائیں گے۔ کیونکہ اس وقت یہ موضوع خاص اہمیت رکھتا ہے

(نگار) زلزلہ کی حقیقت سمجھنے سے پہلے، یہ معلوم کر لینا ضروری ہے کہ کرۂ ارض کی ساخت و کیفیت کیا ہے کیونکہ اسی کے سمجھنے پر زلزلہ کی حقیقت سمجھنا منحصر ہے

آپ زمین کی جس سطح پر چلتے پھرتے ہیں وہ سخت اور ٹھوس ہے، لیکن زمین کے اندر یہ کیفیت نہیں ہے، یعنی جس قدر زیادہ آپ مرکز زمین کی طرف بڑھتے جائیں گے، سطح کی یہ سختی کم ہوتی جائے گی اور گرمی بڑھتی جائے گی۔ یہاں تک کہ مرکز زمین تک پہونچتے پہونچتے یہ گرمی پگھلا دینے والے درجہ تک محسوس ہوگی اور زمین کا مادہ معدنیات کی پگھلی ہوئی کیچڑ کی صورت میں نظر آئے گا

کرۂ زمین تین حصوں میں تقسیم ہے۔ پہلا حصہ جسے بالائی سطح یا خول کہتے ہیں اس کی دبازت ۶۰ میل ہے، اس کے بعد

دوسرا حصہ گرم پتھریلا ہے اور مشتمل ہے۔ مگنیشیم اور چقماقی قسم کے پتھر پر، اس کی دبازت ۹۰۰ میل ہے، اس کے بعد زمین کا وہ مرکزی حصہ ہے جس میں زیادہ تر لوہا اور نکل نیم گداختہ حالت میں پائے جاتے ہیں، اس کی دبازت ۴۲۵۰ میل ہے

کرۂ زمین آفتاب ہی کا ایک ٹکڑا ہے جو دوران گردش میں اس سے علیحدہ ہو گیا تھا۔ اور کروروں برس کے بعد وہ آہستہ آہستہ سرد ہو کر اس قابل ہوا کہ جاندار اُس پر سانس لے سکے۔ پھر جس طرح پگھلی ہوئی چیز کا بالائی حصہ پہلے خشک ہوتا ہے اور پھر رفتہ رفتہ اندرونی حصہ میں انجماد پیدا ہوتا ہے، اسی طرح اوّل اوّل زمین کی وہ بالائی سطح خشک ہوئی جس پر انسان آباد ہے اور اندرونی حصہ ہنوز پوری طرح خشک نہیں ہوا بلکہ اب تک گرم و نرم ہے۔ لیکن زمین کی بالائی سطح بالکل یکساں دبازت کی نہیں ہے کسی جگہ اس کی موٹائی کم ہے اور کہیں زیادہ، اس لئے یوں سمجھنا چاہیئے کہ زمین کا یہ خشک خول جس پر ہم آباد ہیں ایک ایسے ناہموار لکڑی کے تختے کے طرح ہے جو پانی پر تیر رہا ہو اور جس کا دباؤ نیچے کی طرف کہیں کم اور کہیں زیادہ ہو

اس خول کے نیچے جو مادہ پایا جاتا ہے وہ بالطبع دباؤ سے متاثر ہونے والا ہے یعنی جس جگہ اس پر دباؤ زیادہ پڑ جاتا ہے وہ دب جاتا ہے اور جہاں دباؤ کم ہو جاتا ہے وہ اُبھرنے لگتا ہے۔ پھر اگر یہ مادہ پانی کی طرح رقیق ہوتا تو اس دباؤ کا نتیجہ جلد ظاہر ہو جاتا لیکن چونکہ اس کا قوام بہت گاڑھا ہے اس لئے بہت کافی زمانہ کے بعد اس پر دباؤ کا اثر ہوتا ہے

اسی کے ساتھ یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ زمین کے بالائی خشک خول کا دباؤ بہت تغیر پذیر ہے کیونکہ ہوا، پانی، گرمی و سردی کے اثرات سے یہ سطح کسی جگہ پہاڑوں کی متحجر صورت اختیار کر لیتی ہے، کہیں پتھریلا حصہ پس پسا کر غبار بن جاتا ہے اور پانی میں مل کر سمندر کی سطح کے دباؤ کو بڑھاتا رہتا ہے۔ الغرض زمین کا سمٹ کر پہاڑ بن جانا اور پہاڑوں کا مسطح میدان ہو جانا۔ کرۂ زمین کی تاریخ کے وہ واقعات ہیں جو وقت نامعلوم سے جاری ہیں اور معلوم نہیں کب تک جاری رہیں گے

چنانچہ زمین کا وہ حصہ جسے سوئٹزرلینڈ کہتے ہیں کسی وقت ۲۰۰ میل کا بالکل مسطح میدان تھا، لیکن اب وہاں پہاڑ ہی پہاڑ ہیں اور بجائے ۲۰۰ میل کے اس کی پیمائش صرف ۱۲۰ میل رہ گئی ہے

اس قدر معلوم کر لینے کے بعد غالباً یہ سمجھنا آسان ہوگا کہ زمین کے اندرونی حصہ پر بالائی خول کا دباؤ فطری امر ہے اور اس دباؤ سے اندرونی مادہ کا کسی جگہ دب جانا اور کسی جگہ ابھر جانا یقینی ہے۔ فرض کیجئے آپ کسی کشتی پر بیٹھے ہوئے چلے جا رہے ہیں۔ اور اس کے کسی کنارہ پر زیادہ دباؤ پڑ جاتا ہے تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ ظاہر ہے کہ جدھر دباؤ پڑا ہے اس طرف کا کنارہ دب جائے گا اور دوسری طرف کا اونچا ہو جائے گا، لیکن یہ عمل اسی جگہ ختم نہ ہو جائیگا بلکہ پانی اپنی اصلی سطح اختیار کرنے کے لئے پھر متموج ہوگا اور کشتی میں متواتر ادھر اُدھر ہچکولے پیدا ہوں گے۔ بالکل

یہی صورت زمین کی سمجھئے کہ جب بالائی خول کے کسی حصہ کا دباؤ اس کی اندرونی سطح پر زیادہ پڑے گا تو وہ حصہ دب جائے گا اور دوسری طرف کا اُبھرنے لگے گا یہاں تک کہ توازن قائم رکھنے کے لئے متواتر ہچکولے اس کو کھانا پڑیں گے، اور یہی ہے زلزلہ اور اسی لئے کہا جاتا ہے کہ فلاں حصۂ زمین اس قدر بلند ہوگیا اور فلاں اس قدر پست

اب آپ حال کے زلزلۂ صوبۂ بہار کو دیکھئے اور اس پر اس نظریہ کو منطبق کیجئے۔ فرض کیجئے کہ دامن ہمالیہ سے لے کر خلیج بنگال تک کا حصۂ زمین ایک لکڑی کا تختہ ہے جو پانی پر تیر رہا ہے اور خلیج بنگال کی طرف اس کا دباؤ زیادہ ہوگیا، اس لئے لامحالہ نتیجہ یہ ہوگا کہ ہمالیہ کی طرف زمین کا اندرونی مادہ ابھرے گا

پھر مظفرپور، پٹنہ، مونگیر وغیرہ میں جو زمین جا بجا شق ہوئی ہے تو اس کا سبب یہی ہوا کہ خلیج بنگال کی طرف دباؤ زیادہ پڑ گیا اور صوبۂ بہار کی طرف مادۂ زمین نے اُبھر کر ہلچل ڈال دی۔ اسی طرح ۱۹۰۴ء میں جو زلزلہ آیا تھا اس میں وادی کانگڑا کی طرف زیادہ دباؤ پڑا تھا اور اس کا مقابل حصہ سرزمین یو۔پی کا زیادہ متأثر ہوا تھا

پھر چونکہ اس دباؤ کی وجہ سے اندرونی مادہ کا توازن خراب ہوجاتا ہے، اس لئے اُس کے اصلی توازن پر آنے کے لئے کچھ عرصہ تک تموج کی کیفیت باقی رہتی ہے اور یہی سبب ہے کہ ۱۵ جنوری کے بعد بھی ہلکے ہلکے جھٹکے برابر محسوس ہو رہے ہیں اور اس وقت تک محسوس ہوتے رہیں گے۔ جب تک اندرونی مادہ اپنی اصلی سطح پر نہ آجائے

آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ مقامات جو سمندر کے ساحل پر آباد ہیں وہاں اکثر و بیشتر زلزلے آتے رہتے ہیں اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ سمندر میں پہاڑوں اور زمین کا ایک حصہ کٹ کٹ کر دریاؤں کے ذریعہ سے پہونچتا رہتا ہے اور اس لئے سمندر کی سطح کا دباؤ آہستہ آہستہ بڑھتا رہتا ہے اور اس دباؤ کی وجہ سے زمین کے اندرونی مادہ میں تموج پیدا ہوتا ہے اور دوسرا سبب یہ ہے کہ بعض اوقات سمندر کا پانی رِس رِس کر مرکز زمین کی طرف پہونچتا ہے اور وہاں گرم مادہ پر پڑ کر بخارات میں تبدیل ہوجاتا ہے جو اوپر کی طرف بلند ہوکر باہر نکلنا چاہتے ہیں اور اس طرح زمین میں جنبش پیدا ہوجاتی ہے

اب رہا جوتشیوں اور نجومیوں کا یہ کہنا کہ سات سیاروں کا قِران اس کا باعث ہوا ہے، سو اس کی علمی توجیہ ان کی طرف سے یہ کی جاتی ہے کہ ان سیاروں کی کشش سے زمین جنبش میں آئی، لیکن تنقید صحیح کے بعد ان کی یہ توجیہ پایۂ اعتبار سے گر جاتی ہے، کیونکہ اس زمانہ میں سات سیاروں کا قِران منطقۂ جدی (Zodiac of Capricorn) میں ہوا تھا جو خط استوا سے ۲۲½ درجہ جانب جنوب واقع ہے، اس لئے اصولاً ان کی کشش کا اثر کرۂ زمین کے جنوبی حصہ پر زیادہ ہونا چاہیئے تھا۔ اور آسٹریلیا، جنوبی افریقہ اور جنوبی امریکہ میں زلزلہ محسوس ہونا ضروری تھا، نہ کہ صوبۂ بہار میں جو خط استوا سے مابین ۲۶ و ۲۹ درجہ جانب شمال واقع ہے۔ اور جنوبی حصہ سے ۲۵۰۰ میل کا بُعد رکھتا ہے

علاوہ اس کے یہ سات سیاروں کا قِران چند منٹ تک تو رہا نہیں۔ بلکہ کئی دن تک رہا ہے۔ اس لئے سمجھ میں نہیں آتا کہ دورانِ قِران یہ مصیبت صرف ایک بار ظاہر ہوکر کیوں ختم ہوگئی

پھر اگر یہ معاملہ صرف سیاروں کی کشش کا تھا تو اس کا بہت زیادہ اثر سمندروں پر ہونا چاہیئے تھا جو رقیق ہونے کے لحاظ سے کشش کو زیادہ قبول کر سکتے ہیں نہ کہ صوبۂ بہار کی سرزمین پر جو یقیناً پانی کے مقابلہ میں زیادہ ٹھوس اور جامد ہے

جو کچھ میں نے عرض کیا ، یہ ہے حال کی تحقیق زلزلہ کے متعلق ، لیکن اس کو آخری لفظ قرار دے کر یہ باور کر لینا کہ ترقی علوم کی آیندہ منزل اس میں کوئی اور اضافہ نہ کر سکے گی ، یا کچھ اور اسباب اس کے دریافت نہ ہو سکیں گے ، صحیح نہیں ـــــ مگر ہاں یہ بالکل یقینی ہے کہ زلزلہ کا سبب وہ فرشتے نہیں ہیں جو کوہِ قاف کے گرد زنجیریں ڈالے ہوئے بیٹھے ہیں اور جب وہ اسے بچڑا کر ہلا دیتے ہیں تو ساری زمین پر جنبش پیدا ہو جاتی ہے

حضرت نیاز کے ادبی شاہکاروں کا نیا مجموعہ

جمالستان

(نگارستان کا دوسرا حصہ حجم ۵۰۰ صفحات)

قیمت فی کاپی مجلد للہ ـــــ غیر مجلد للہ ـــــ علاوہ محصول

خریداران نگار سے ـــــ ایکروپیہ کی رعایت

کتب فروشوں کو ۲۵ فیصدی کمیشن

فہرست مضامین حسب ذیل ہے :-

دنیا کا اولین بت ساز — فریب خیال — صدائے شکست — دو گھنٹے جہنم میں

ایک شاعر کی محبت — میر بیدانہ — تاریخ عرب کی ایک روایت جمیل — ایثار

شہید آزادی — بعد المشرقین — ولے بخیر گزشت — ٹیلی فون نمبر ۶۷۰

دو خط — جانعالم اور ملکہ مہرنگار — چند گھنٹے ایک مولوی کے ساتھ — شبنستان کا قطرۂ گوہریں

سودائے خام — درس محبت — ازدواج مکرر — انتظام علی صاحب

۲۵ء کا ایک صوفی — ایک شاعر کا انجام — آدم وحوا سے پہلے — شہزادۂ خرم اور ابابیل

زہرہ کا ایک پجارنی — رادھا — سرزمین دکن کی ایک دلنواز شام — نوجوان شہزادہ

مطربۂ فلک — چنگاری — محلہ کی رونق — داستان حسن وعشق کا ورق خونیں

باب المراسلۃ والمناظرہ

(جناب شیر احمد خاں صاحب وکیل لودھیانہ)

محترم بندہ جناب مولانا نیاز صاحب

السلام علیکم ،

دسمبر ۱۹۳۳ء کے "نگار" میں "ملاحظات" کی تحت میں "عیش یا مسرت" کے عنوان سے آپ کا دلچسپ مضمون میری نظر سے گذرا، آپ نے اس مضمون میں نہایت خوب صورت الفاظ میں "عیش یا مسرت" کی حقیقت پر تفصیلی بحث کی ہے، اور اسی ضمن میں مذہب، وطنیت، قومیت ہر سہ تحریکات کے مضر اثرات و نتائج پر بھی تنقید کی ہے، "امن وسکون" کا واحد ذریعہ" کے ضمنی عنوان میں آپ نے یوں مشورہ دیا ہے، کہ "اگر دنیا کو واقعی امن وسکون کی ضرورت ہے، تو اس کا حصول نہ تجارتی مفاہمت سے ہوسکتا ہے، نہ تخفیف اسلحہ کی کوشش سے، بلکہ صرف اس طرح کہ تمام ممالک کے اہل الرائے ایک جگہ جمع ہوکر، حکومتوں کے اختلاف کو مٹائیں اور تمام ممالک کو اصول فیڈریشن پر ایک نظام حکومت سے وابستہ کردیں" اگر آپ کے اسی مشورہ کے مطابق عمل نہ کیا گیا، تو "—— یقین رکھنا چاہیے، کہ دنیا کو ایک بار ضرور تباہ ہونا ہے خواہ وہ تباہی اس کو پھر عہد وحشت کی طرف لیجا کر کسی اور تہذیب وتمدن کی بنیاد ڈالنے پر مجبور کرے، یا قیامت کبریٰ" قائم کرکے نظام شمسی میں ایک اور ویران غیر آباد کرہ کا اضافہ کرنے والی ثابت ہو"

جس "عیش یا مسرت" کا آپ نے اپنے مضمون میں ذکر کیا ہے، وہ عیش یا مسرت" ہرگز منتہائے مقصد حیات انسانی نہیں، اس کی تلاش انسان پر فرض، اور اس کے بغیر انسان کی زندگی اجیرن نہیں ہوجاتی۔ انسانی زندگی بلند مقاصد کی جستجو میں ہے اور وہ بلند مقاصد "عیش ومسرت" کی آغوش میں نہیں، "عیش ومسرت" کی آغوش خواب آور اور آرزو کش ہے، انسان اس دنیا میں اپنی عبدیت کے لیے خلق کیا گیا عیش ومسرت" کے حصول کے لئے نہیں کوئی مذہب انسان کو دنیا میں حصول عیش ومسرت کی تعلیم نہیں دیتا اور نہ ہی مذہب طلسم ہوشربا، اور تخیلی فردوس کا نام ہے، اگر مسرت کہیں ہے تو وہ انسانی فرایض کو بہ طریق احسن ادا کرنے کے اطمینان قلبی

ہیں۔ دنیا نے امن وسکون کی بیہودہ تلاش میں کئی خونیں قلزم عبور کئے، مگر اب تک اُسے وہ امن وسکون نصیب نہیں ہوا، اور نہ ہی مستقبل قریب میں کسی ایسے امن وسکون کے ظہور کی توقع کی جاسکتی ہے، زندوں کی بستی میں کبھی امن وسکون نہیں رہ سکتا، البتہ مُردوں کی دنیا یعنی قبرستان میں ہمیشہ خاموشی پُر ہیبت سکون، اور امن ہر وقت مسلط رہتا ہے، دنیا کو قبرستان کے امن وسکون کی ضرورت نہیں ——— مذہب پر سب سے بڑا الزام جو آپ نے عائد کیا ہے وہ یہ ہے، کہ "مذہب نے خون ریزی، اور خونفشانی کے سوا، کوئی خدمت سرانجام نہیں دی" حق وباطل کی آویزش فطرت کا ایک عالمگیر، اَن مٹ، قانون ہے، جس کی سرتابی میرے اور آپ کے اختیار سے باہر ہے (کم ازکم میں اپنے متعلق ضرور کہہ سکتا ہوں آپ شاید اپنے کو مستثنےٰ کردیں) دن اور رات کا انقلاب، روشنی اور تاریکی، گرمی اور سردی، بہار اور خزاں، سورج اور چاند کی گردش قانون قدرت کے یہ عالمگیر مظاہر ہے اس امر کے مقتضی ہیں، کہ حرکت نہ ختم ہونیوالی، حرکت فطرت کی ہر شے میں حکمراں رہے، اور ہر لمحہ بدلنے والی دنیا کا ہر انقلاب پذیر ذرہ امن و سکون کے خلاف علم جہاد بلند کئے ہوئے ہو۔ جد وجہد اور ہر حرکت "بقاء اصلح" کے جہاں گیر اصول کی زندہ تشریح ہے۔ جب تک سورج مشرق سے نکل کر مغرب میں غروب ہوتا رہے گا، اس وقت تک انسانوں کی بستی میں آپس میں محبت اور پیار، جنگ وفساد، صلح وآشتی، نفاق اور فراق کے رنگین مناظر آنکھوں کے سامنے اسی طرح رقصاں رہیں گے۔ جدال وقتال، بربادی وآبادی، لازمہ حیات انسانی ہیں۔ یہ ابتدائی اصولی غلطی ہے، اگر کوئی کسی تحریک یا مذہب سے یہ توقع رکھے، کہ وہ دنیا میں بہشت قائم کرے۔ اور پھر بہشت بھی وہ جس کے متعلق یہ کہا جائے ؎

بہشت آنجا کہ آزارے نباشد
کسے را با کسے کارے نباشد

دنیا کا یہ وسیع کارخانہ قبرستان کے امن وسکون کے لئے مرتب نہیں کیا گیا۔ جو لوگ اسی دنیا میں ایسی بہشت کی متلاشی ہیں، وہ سخت دھوکے میں ہیں۔ اور اک سراب کے تعاقب میں اپنی زندگیاں ضائع کر رہے ہیں۔ انسان کا جسم صحت، اور بیماری کے عوارضات کا تختۂ مشق اسی طرح بنتا رہے گا۔ اس کا دل اسی طرح بڑھتی ہوئی امنگوں، اور پُرجوش آرزوؤں کا مسکن رہے گا، اور جسد للبقا کا لازوال نہ مٹنے والا قانون کائنات کے ہر ذرہ پر اسی طرح حکمراں رہے گا، خواہ آپ مانیں یا نہ مانیں، چاہیں یا نہ چاہیں، یہ جنگیں یہ فسادات یہ خوں ریزیاں اور خوں آشامیاں اسی طرح دنیا کے چہرہ کو بدنما کرتی رہیں گی۔ انسان فرشتہ تو ہونے کو ہا۔ حرص وآز، ہوس اور خودغرضیاں جن انسانی اعمال کے محرکات ہوں ان کا نتیجہ بدیہی تباہی، اور فساد ہے، مذہب اک جادہ اعتدال کا نام ہے، جس جادہ اعتدال پر گامزن ہوکر انسان دنیا کی فلاح وبہبود، اور بنی نوع انسان کی وسیع برادری میں باہمی اخوت وپیار کا باعث بن سکتا ہے، انسان میں جو درندگی اور حیوانیت پائی جاتی ہے، وہ مذہب کے اصلاح کن اثر سے، اطاعت، اور شفقت کے پاکیزہ جذبات میں بدل سکتی ہے، تنہا مذہب وہ مقدس تحریک ہے، جس نے انسان کی درندگی اور بہیمیت کو اخوت اور اطاعت میں بدل کر دربار خداوندی میں عبدیت کی قبا کے ساتھ خلافت الارض کی خلعت پہنادی ہے۔ باقی رہیں وہ جنگیں، جو دنیا میں مذہب کے

نام پر کی گئی ہیں، ان میں سے بعض تو محض جوع الارض اور بادشاہوں کی اپنی انانیت کا نتیجہ تھیں، اور وہ جنگیں جو خالصاً اللہ کے راستہ میں.... لڑی گئیں، وہ نسل انسانیت کی صحیح نشوونما اور تربیت کے لئے عین ضروری تھیں، جراثیم زدہ اعضا کا کاٹ دینا ہی دیگر اعضاء کی تندرستی، اور صحیح تربیت کے لئے ضروری ہے ہر تخریب میں تعمیر، ہر بربادی میں آبادی، اور ہر ویرانہ میں بستی کے آثار اور نشانات پائے جاتے ہیں، ہر نئی تعمیر کے لئے قدیم تعمیر کا گرایا جانا ضروری ہے، الفاظ کی بہشت تو آپ ساحر و نگار ہر ورق پر قائم کر سکتا ہے۔ مگر انسانی اعمال سے ایسی بہشت دنیا میں نہ کبھی قائم ہوئی ہے اور نہ کبھی قائم ہوگی۔ دنیا فرشتوں کی بستی نہیں بن سکتی، اور نہ ہی دنیا مہاتماؤں کا مندر ہے، انسانی زندگی میں قہقہے بھی ہیں اور آہیں بھی، جد وجہد کی صوبتیں بھی، تحمل و برداشت کی آذیتیں بھی، ناکامیابیوں کی تلخ کامیاں بھی۔ ع

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفوی سے شرار بو لہبی

موجودہ برسر اقتدار حکومتیں جو دنیا میں امن و سکون قائم کرنے کی کوششیں کبھی تخفیف اسلحہ کی صورت میں، اور کبھی تجارتی مفاہمت کی صورت میں کر رہی ہیں، یہ محض ان کی سیاسی چالیں ہیں، ان کی ان کوششوں کا مقصد صرف یہ ہے کہ مغلوب اقوام اپنا سر نہ اٹھائیں، اور اپنے غصب شدہ حقوق اُن سے طلب نہ کریں، وہ اب جنگ اس لئے نہیں چاہتے۔ کہ کہیں دوسری جنگ میں وہ سب کچھ کھو نہ بیٹھیں، جو انھوں نے گذشتہ جنگوں میں حاصل کیا ہے۔ وہ امن اب اس لئے چاہتے ہیں، کہ گذشتہ جنگ کی تھکان دُور کر لیں، اور جو کچھ انھوں نے گذشتہ جنگوں میں حاصل کیا، اُس مال غنیمت کو اطمینان کے ساتھ اب بیٹھ کر اچھی طرح ہضم کر لیویں، وہ دوسروں کے غصب شدہ حقوق اُگلنا نہیں چاہتے۔ دُنیا کی موجودہ تقسیم دولت، و حکومت پر وہ مطمئن ہیں، اور اس تقسیم میں کسی مزید تبدیلی اور انقلاب کو اب وہ نہیں چاہتے، امن و سکون کی یہ کوششیں اگر کامیاب ہوگئیں۔ تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ مغلوب اقوام ہمیشہ کے لئے مغلوب رہیں گی، اور وہ کبھی بھی حریت کی حیات آفریں فضا میں زندگی حاصل نہ کریں گی

اختلافات مادی ہوں یا اعتقادی، ہمیشہ سے چلے آئے ہیں، اور اسی طرح قائم رہیں گے۔ میری اور آپ کی مساعی آنے والی "قیامت کبریٰ" کو روک نہیں سکتیں۔ اور اسی "قیامت کبریٰ" کے لوٹ جانے میں درحقیقت مظلوم اور بے دست و پا اقوام کے لئے کوئی فلاح و بہبود مضمر نہیں ہے۔ جنگیں ہمیشہ مظلوم کو ظالم کی دستبرد سے نجات دلاتی ہیں اور اکثر قوموں کیلئے تازیانہ عبرت کا حکم رکھتی ہیں۔ (War is a biological process ایک انگریزی مقولہ ہے۔ جنگ بھی افزایش نسل کے لئے ضروری ہے۔ انسان تحفظ نفس کے لئے اپنے گرد و پیش کے حالات

سے برسرپیکار رہنے پر مجبور ہے، انسان دنیا میں کائنات ارضی پر حکمرانی کے لئے خلق ہوا ہے اس لئے اُسے پانی، ہوا، اور زمین کو اپنے زیر نگیں کرنا ہے، مذہبی اختلافات بالکل مٹ نہیں سکتے، البتہ کم شاید ہو جائیں، نیکی اور بدی، کفر اور ایمان دونوں کی زندگیاں پہلو بہ پہلو جاتی ہیں۔ ان کی باہمی آویزش سے گریز عبث اور بزدلی ہے۔ البتہ اس جنگ میں بلند ہمتی سے شرکت، صحیح فتح ہے، جنگل کو سبزہ زار بنانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ پہلے اُسے خس وخاشاک سے پاک صاف کیا جائے۔ کپڑا انسان کے جسم پر اس وقت راست آتا ہے جب درزی اسے پہلے کاٹ دیتا ہے، انسان کو نقطہ کھلونا نہ جانئے، جو محض کھیلنے کودنے اور ہنسنے کے لئے دنیا میں آیا ہو، محبت، نفاق اور دشمنی انسانی قلب کی یہ سہ گونہ کیفیات ازلی اور ابدی ہیں، اسی بنی نوع انسان کی وسیع برادری میں ہمیشہ سے مومنوں، منافقوں اور منکروں کے گروہ قائم رہے ہیں

دنیا میں کوئی مذہب انسان کو انسان سے نفرت کا درس نہیں دیتا۔ البتہ جو شخص ننگ انسانیت ہو، اس کے عدم کو وجود سے بہتر ضرور سمجھتا ہے۔ اگر اس کے متعلق اصلاحی قوتیں بیکار ثابت ہو چکی ہوں

باقی رہا اس ملک کی فرقہ پرستی، اس کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ ع

اے بادصبا ایں ہمہ آوردۂ تست

باہمی بدگمانی نتیجہ ہیں، قوموں کے باہمی عدم توازن کا، جو قوم اپنے کو کمزور سمجھتی ہے۔ وہ اپنی بقا، کے لئے تحفظات کے تعیین کے لئے فطرتاً مجبور ہے، تحفظات کے مطالبہ کو اقلیت بھی اس حالت میں ترک کر سکتی ہے۔ اگر اکثریت اور بالخصوص طاقتور اکثریت اپنی روش اور اپنے سلوک سے اقلیت کے دل میں اپنے لئے اعتماد پیدا کر دے۔ فرقہ وارانہ ذہنیت ہمیشہ قوموں میں باہمی بداعتمادی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اکثریت کا اقلیت کے حقوق اور مفاد کے ساتھ غیر مشفقانہ اور غیر ہمدردانہ سلوک اقلیت کو ہمیشہ اکثریت سے بدگمان کر دیتا ہے۔ جس ملک یا بستی میں بداعتمادی کی فضا مسلط ہو، ایک طرف سے تحفظات حقوق کی طلب ہو، اور دوسری طرف سے اس طلب کا جواب اغماض، اور گریز سے دیا جا رہا ہو اس کا بدیہی نتیجہ یہ ہے کہ اس ملک کی قوموں میں منافرت کی خلیج وسیع ہوتی چلی جائے۔ ایسے ناخوشگوار حالات کے اصلی اسباب کا تعین کبھی مفید نتیجہ کا باعث نہیں ہوا، ہندوستان کے مسلمان لاکھ قربانیاں کریں، اور اپنی زندگیاں استخلاص وطن کی مقدس تحریک کے لئے وقف کر دیں، مگر اکثریت کے قلوب میں ان کے لئے کبھی ہمدردی اور محبت کے جذبات پیدا نہ ہوں گے۔ غلط یا درست وہ اس ملک کو تنہا۔ اپنی ملکیت سمجھے ہوئے ہیں، اور انھیں ہر مسلمان محمود غزنوی نظر آ رہا ہے، باہمی مصالحت اور مفاہمت کی ساعی ہمیشہ مبارک ہیں، اور ہر شریف انسان باہمی اعتماد کو بداعتمادی پر ترجیح دے گا، لیکن ہر مبارک سعی کی کامیابی یقینی نہیں ہے،

ہندوستان کی گذشتہ تاریخ از سر نو مرتب اگر ہو سکتی ہے تو شاید پھر باہمی مصالحت کی مساعی بھی مشکور ہوں، اور البتہ یہ امر یقینی ہے کہ اگر دونوں اقوام کو آپس میں یہاں مل جل کر رہنا ہے، تو انھیں ایک نئی تاریخ مرتب کرنی ہوگی اور تاریخ ہند

میں "مسلمانوں کا باب" جس انداز اور ترتیب سے اب مرتب ہے، وہ یقیناً بدلنا پڑے گا۔ اور شاید ہندوستان کی تمام گذشتہ تاریخ کو ایک سفید ورق کی صورت میں تبدیل کرنا ہو

خدارا اپنے مضامین میں الفاظ کی بہشت قایم کرکے مسلمان نوجوانوں کو محض شاعر اور نگار پرست نہ بنائیے۔ میں نے آپ کے رسالہ کے اکثر نوجوان قارئین کو محض بیکار دیکھا ہے۔ بیشک وہ آپ کے مضامین۔ شگفتہ تراکیب اور بلند تخیلات کو مزے لے لے کر پڑھتے ہیں۔ مگر عملی اعتبار سے محض اینٹ اور پتھر کی طرح جامد ہیں۔ نیت تو یقیناً آپ کی مبارک اور نیک ہے، مگر بدقسمتی سے نتائج خطرناک پیدا ہو رہے ہیں، کاش آپ میرے ساتھ یہاں ہوں تو میں آپ کو دکھلاؤں کہ اس "نگار پرستی" نے کتنے مسلمان نوجوانوں کو گمراہ، بیکار، اور گستاخ کر دیا ہے۔ خدا اُس علم سے محفوظ رکھے، جو شر اور گمراہی پھیلائے

(نگار) اُن تمام صریحی اختلافاتِ بیانی کو نظر انداز کرنے کے بعد جو جا بجا آپ کی تحریر میں نظر آتے ہیں، اس کی تلخیص یہ کر سکا ہوں کہ :-

(۱) دنیا میں امن و سکون کی تلاش، جستجوئے محال ہے

(۲) مذاہب عالم کا مقصد کبھی "عیش و مسرت" کا حصول نہیں تھا بلکہ صرف "عبدیت" کی کیفیت انسان پر طاری کرنا تھا

(۳) مذاہب عالم کی خونریزی و خون آشامی عین فطرت کے مطابق ہے کیونکہ حق و باطل کی جنگ فطری قانون ہے

(۴) دنیا میں کوئی مذہب انسان کو انسان سے نفرت کرنے کا درس نہیں دیتا مگر جو شخص ننگ انسانیت ہو اس کو ضرور فنا کر دینا چاہتا ہے

(۵) ہندوستان میں ہندو مسلمانوں کی مصالحت ناممکن ہے جب تک تاریخ ہند میں "مسلمانوں" کا باب بالکل نہ بدل دیا جائے

(۶) نگار کی تحریریں ملک کے نوجوانوں کو گمراہ، بیکار اور گستاخ بنا رہی ہیں ——— اور یہ کہ

(۷) خدا اُس علم سے محفوظ رکھے جو شر اور گمراہی پھیلائے

آخری دو باتیں حذف کرنے کے بعد جن کا تعلق صرف نگار یا صاحب نگار سے ہے اور جن کا جواب دینا چنداں ضروری نہیں، باقی تمام امور یقیناً غور طلب ہیں لیکن افسوس ہے کہ فاضل مُراسلہ نگار نے جو تنقیح و جرح کی ہے اسے ژولیدگی و تناقض کے لحاظ سے کسی کامیاب قانون پیشہ شخص سے منسوب کرنا اچھا نہیں معلوم ہوتا

قبل اس کے کہ میں فاضل مُراسلہ نگار کی تصریحات پر تنقید کروں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے میں دسمبر کے "ملاحظات" کا مفہوم یہاں مختصر طور پر ظاہر کر دوں جس کے خلاف صاحب مضمون نے احتجاج کیا ہے

میں نے دسمبر کے ملاحظات میں ظاہر کیا تھا کہ عیش و مسرت دو بالکل علیحدہ چیزیں ہیں عیش نام ہے جسم کی آسایش کا حواس ظاہری کی لذت کا اور مسرت نام ہے اطمینانِ نفس اور راحتِ روح کا ، اس لئے اگر دنیا واقعی امن و سکون کی طلبگار ہے تو اُسے اسباب عیش کی جستجو نہ کرنا چاہیئے بلکہ حصولِ مسرت کے درپے ہونا چاہیئے ۔ اسی سلسلہ میں میں نے یہ بھی ظاہر کیا تھا کہ اس کے حصول میں اس وقت تک نہ مذاہب عالم کامیاب ہوئے ہیں ، نہ جذبۂ قومیت و وطنیت کو کامیابی نصیب ہوئی ہے اور نہ علم و حکمت کی ترقی اس جنس گرانمایہ تک دسترس پاسکی ہے ۔ اس لئے اب اگر تجربہ باقی رہ گیا ہے تو صرف یہ کہ تمام مذاہب کو صرف ایک مرکز پر لایا جائے جسے " انسانیت پرستی " کہتے ہیں اور جملہ حکومتوں کو صرف ایک نظامِ حکومت سے وابستہ کیا جائے ۔ جو تمام سلطنتوں کے تحالُف و مواخاۃ سے حاصل ہو سکتا ہے

یہ تھا میرا مفہوم جس سے مراسلہ نگار نے نہ صرف یہ کہ اختلاف کیا ہے ، بلکہ بعض نئی باتیں ایسی پیش کی ہیں جن کے سمجھنے کے لئے مجھے خود استفسار کی ضرورت محسوس ہوتی ہے

(۱) و (۲) دُنیا میں امن و سکون کی تلاش جستجوئے محال ہو یا جستجوئے ممکن ، لیکن غالباً اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ہے وہ بالکل فطری چیز ـــــ نہ صرف انسان بلکہ وحوش و طیور اور نباتات بھی اسی چیز کی جستجو میں ہیں اور مخلوقات کا فطری خود غرض پیدا کیا جانا اسی مصلحت کے ماتحت ہے کہ وہ اس کی جستجو میں لگے رہیں پھر چونکہ امن و سکون انفرادی و اجتماعی دونوں حیثیتوں سے فطری اقتضا ہے ، اس لئے یہ کہنا کہ دُنیا میں حقیقی مسرت کوئی چیز نہیں ، بلکہ اصل شے " عبدیت " ہے اور اسی کی اشاعت کے لئے مذاہب عالم وجود میں آئے بالفاظ دیگر یہ مفہوم رکھتا ہے کہ مذاہب کا تعلق مسرت یا اطمینانِ نفس سے نہیں بلکہ کسی اور چیز سے ہے جس کا نام فاضل مراسلہ نگار نے " عبدیت " رکھا ہے

مجھے اس سے بالکل اتفاق ہے ، لیکن غالباً قابل معترض نے اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا کہ جس چیز کو وہ " عبدیت " سے تعبیر کرتے ہیں ، وہی میرے نزدیک سکونِ نفس و اطمینان ضمیر ہے

" عبدیت " کسے کہتے ہیں ؟ اگر اس کا مفہوم صرف یہ ہے کہ ایک انسان اپنے آپ کو خدا کا بندہ سمجھ کر صرف رشتۂ عبد و معبود پر اعتماد کرے اور عبادت و نیایش کے مروجہ طریقوں پر کاربند ہو کر اپنے فرایض عبدیت سے عہدہ برآ ہو جانے کا یقین رکھے ، تو یہ ایسی ادنیٰ درجہ کی تعبیر ہوگی کہ انسان و حیوان کے درمیان کوئی فرق باقی نہ رہے گا کیونکہ انسان کا خدا کے مُقابلہ میں صرف اپنے آپ کو عاجز اور بندۂ بیچارہ سمجھ لینا کوئی معنی نہیں رکھتا ، ایک جانور بھی انسان کے ہاتھ میں اپنے آپ کو ایسا ہی سمجھتا ہے

فرض کر لیجئے ایک انسان خدا سے ڈر کر رات دن اس کی عبادت میں مشغول رہتا ہے تو اس سے مدعا کیا ہے یعنی وہ کس امر سے خایف ہو کر اس کی پوجا کرتا ہے ، ظاہر ہے کہ اس کا یہ فعل کسی غرض سے خالی نہیں ہو سکتا ، یعنی وہ یا تو اپنی دنیاوی فلاح و ترقی کی امید پر ایسا کرتا ہے یا اخروی نجات کی ترقی پر ۔ اگر مقصود وہ ہے تو محض یہ " خوفِ عبدیت "

بیکار ہے جب تک وہ دنیا کے اصول پر نہ چلے اور اگر مدعا دوسرا ہے تو ایسا انسان دنیا اور دنیا والوں کے لئے بیکار ہے ——— میرے نزدیک "عبدیت" کا صحیح مفہوم صرف یہ ہے کہ انسان جس طرح اپنے آپ کو خدا کا بندہ سمجھتا ہے اسی طرح دوسروں کو بھی سمجھے اور دوسروں کے احساسات کی پامالی پر اپنے جذبات کی کامیابی کی بنیاد قائم نہ کرے۔ اسی کا میں نے دوسرا نام "انسانیت پرستی" رکھا ہے اور یہی مقصود مذہب کا ہونا چاہئے۔ لیکن چونکہ تجربہ اس کے خلاف ثابت ہوا ہے۔ اور اس وقت تک مذاہب اس مقصد میں کامیاب نہیں ہوئے۔ اس لئے لامحالہ ہم کو "مذہب" کا کوئی اور بلند مفہوم قائم کرنا پڑے گا اور وہ صرف یہی ہو سکتا ہے کہ "لامذہبیت" مذہب قرار دیا جائے جسے دوسرے الفاظ میں (morality without religion) بھی کہہ سکتے ہیں

آپ خود تسلیم کرتے ہیں کہ "مسرت نام ہے انسانی فرایض کو بہ طریق احسن ادا کرنے" کا اس لئے کیا میں یہ سوال کر سکتا ہوں کہ کیا انسانی فرایض میں اہم ترین فرض یہ نہیں ہے کہ وہ دوسرے انسانوں کو بھی خواہ وہ کسی قوم و ملت سے تعلق رکھتے ہوں ہمدردی کی نگاہ سے دیکھے اور اُن کے ساتھ رشتۂ اخوت و محبت قایم کر کے تنگ نظری و عصبیت کو دُور کر دے۔ پھر اگر اس کا جواب آپ اثبات میں دیں گے (اور یقیناً دیں گے) تو آپ کو میرے اس قول سے کیوں اختلاف ہے کہ انسان صرف قیام مسرت کے لئے وضع ہوا ہے نہ کہ اسبابِ عیش کی فراہمی کے لئے۔ رہا آپ کا یہ فرمانا کہ "مذہب طلسم ہوشربا اور تخیلی فردوس کا نام نہیں ہے" سو اس کے جواب میں بجز اس کے کیا عرض کر سکتا ہوں کہ

چھٹی جاتی ہے یہ دیکھو تو سراپا کس پر

میں، کہ سرے سے اس قسم کی فردوس و بہشت کا قائل ہی نہیں ہوں، کیونکہ موردِ الزام قرار پا سکتا ہوں، یہ تو آپ اپنے انھیں برادرانِ مذہب سے کہئے جنھوں نے فردوس کو طلسم ہوشربا کیا، اس سے بھی زیادہ عجیب و غریب چیز بنا کر پیش کیا ہے۔ حالانکہ

وشتان ما بین خلّ وخمر

(۳) آپ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ "مذاہب عالم کی خونریزی و خوں آشامی عین فطرت کے مطابق ہے، کیونکہ حق و باطل کی جنگ فطری قانون ہے" ——— یہ غالباً آپ نے صرف اس بات کو پیش نظر رکھ کر کہا ہے کہ آپ مسلمان ہیں۔ اور اسلام ہی سچا مذہب ہے ——— لیکن بندہ نواز، جس طرح آپ کو یہ کہنے کا حق حاصل ہے، اسی طرح دوسرے مذاہب والے بھی کہہ سکتے ہیں۔ پھر اس کا فیصلہ کیونکر ہو کہ راستی پر کون ہے۔ ظاہر ہے کہ جب مختلف دعوؤں میں باہمد گر اختلاف و تضاد ہوگا تو ہم کو جانچنے کے لئے کوئی معیار قائم کرنا پڑے گا اور مذاہب

کے تناقض ونزاع کے باب میں یہ معیار صرف "عقل وفطرت" ہی ہوسکتا ہے — پھر غور کیجئے کہ اس وقت کون سا مذہب اس معیار پر ٹھیک اترتا ہے ؟ غالباً کوئی نہیں اور اس لئے لامحالہ تمام موجودہ مذاہب کو علیحدہ کرکے کوئی اور نئی صورت اختیار کرنا پڑے گی جو "مذہب انسانیت پرستی" کے علاوہ کچھ اور ہو ہی نہیں سکتی

اسٹرنڈبرگ (Strindberg) کا ایک مشہور ڈرامہ ہے جس میں ایک عیسائی عورت کسی فوجی کپتان کو جو منکر خدا ہے مذہب کی طرف مایل کرتی ہے اور خدائی محبت کی داستان سنانے لگتی ہے۔ کپتان سب کچھ سننے کے بعد کہتا ہے "ٹھیک اسی وقت جب تم خدا اور اس کی محبت کا ذکر کرتی ہو، تمہاری آواز میں سختی پیدا ہوجاتی ہے اور تمہاری آنکھوں سے جذبۂ نفرت واستکراہ ٹپکنے لگتا ہے، ایسا کیوں ہے؟"

چنانچہ یہی وہ تلخ حقیقت تھی جس کی بناء پر اسے کہنا پڑا کہ

The world would be more religious place if all the religions were removed from it.

یعنی اگر آج دنیا سے تمام مذاہب محو ہوجائیں تو دنیا زیادہ مذہبی جگہ ہوجائے

Baron Von Hogel کا قول ہے کہ

Religion is an "Isness" and not an "Oughtness"

مذہب کا تعلق ہمیشہ "ہے" سے رہا ہے "چاہئے" سے نہیں۔ یعنی وہ اس سے بحث نہیں کرتا کہ حقیقت کیا ہے بلکہ صرف اسی کو صحیح سمجھتا ہے جو بظاہر اسے نظر آتا ہے —— یعنی اگر وہ یہ سکھاتا ہے کہ آپس میں محبت رکھو، فتنہ وفساد سے علیحدہ رہو تو اس کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ اس عمل کو صرف ایک مخصوص حلقہ میں محدود رکھا جائے اور دوسرے مذہب والوں کو اس سے خارج سمجھا جائے، پھر ظاہر ہے کہ جب تمام مذاہب .... اس خیال کے حامی ہوں گے تو ان کا باہمد گر کشت وخون میں مبتلا ہوجانا یقینی ہے اور اس وقت تک جو خونریزیاں مذاہب کی طرف سے ظاہر ہورہی ہیں ان کا سبب یہی ہے کہ ہر مذہب والا اپنی جگہ اپنے آپ کو حق پر سمجھتا ہے اور دوسرے کو باطل اور بقول ہمارے فاضل مراسلہ نگار کے حق وباطل میں جنگ ہونا بالکل فطری امر ہے

اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ مذاہب عالم کا درس محبت بھی حد درجہ قاتل وخونریز درس ہے اور کسی کا یہ قول بالکل صحیح ہے کہ

Religion engenders a great love to a great hate.

(۴) آپ کا چوتھا دعوے یہ ہے کہ دنیا میں کوئی مذہب انسان سے انسان کو نفرت کرنے کا درس نہیں دے گا مگر جو شخص ننگ انسانیت ہو اُسے ضرور فنا کردینا چاہتا ہے —— اس دعوی کا پہلا حصہ بالکل واقعہ وحقیقت کے خلاف ہے۔ کیونکہ ایک انسان نے دوسرے انسان سے نفرت کرنا، مذہب ہی سے سیکھا اور کافر وملکش کی

اصطلاحیں اس کا کھلا ہوا ثبوت ہیں - کیا آپ بہ حیثیت مسلمان ہونے کے ہندوؤں سے اس لئے متنفر نہیں ہیں کہ وہ رام وکرشن کے ماننے والے ہیں اور کیا ہندو آپ کو اس لئے ناپاک نہیں سمجھتے کہ آپ کا مذہب بُت شکنی سکھاتا ہے اور پھر ایک ہندو یا مسلمان ہی پر کیا موقوف ہے، گبر و ترسا، یہود و نصاریٰ، سبھی اس عذاب میں مبتلا ہیں اور ایک کا دوسرے سے نفرت کرنا مذہبی اختلاف ہی کی وجہ سے ہے

اب رہا یہ خیال کہ جو ننگ انسانیت ہو اس کو ضرور ہلاک کر دینا چاہیئے، سو براہِ کرم بتائیے کہ اس سے زیادہ انسانیت کی کیا توہین ہو سکتی ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان سے صرف اس لئے نفرت کرے کہ وہ اس کے مذہب کے شعائر کے خلاف خدا کی پرستش کرتا ہے - یعنی سوال خدا کی نافرمانی کا نہیں بلکہ صرف اس بات کا ہے کہ کیوں ایک مخصوص و متعین طور پر اس کی پوجا نہیں کی جاتی

پھر جب حالت یہ ہے تو آپ ہی کے فیصلہ کے مطابق اس وقت تمام اہل مذاہب کو فنا کر دینا چاہیئے، کیونکہ وہ سب کے سب ننگ انسانیت ہیں

(۵) آپ کا یہ فرمانا کہ ہندو مسلمانوں میں اتحاد ناممکن ہے جب تک ہندوستان کی تاریخ سے مسلمانوں والا باب بالکل نہ بدل دیا جائے - اچھی طرح سمجھ میں نہ آیا - اگر اس سے یہ مراد ہے کہ ہندو صرف اس لئے مسلمانوں کی طرف سے صاف دل نہیں ہو سکتے کہ وہ فاتحانہ حیثیت سے یہاں آئے اور بت شکنی کی، تو یہ ایک حد تک اصولاً درست ہے، لیکن میں یہ پوچھتا ہوں کہ اب جبکہ مسلمانوں میں اُن کے اسلاف کی کوئی خصوصیت باقی نہیں رہی، وہ کیوں اب تک "پندار فاتحانہ" میں مبتلا ہیں - اور وہ کیا چیز ہے جو ان میں ملک و وطن کی محبت پیدا ہونے نہیں دیتی - کیا ہندوؤں کی طرح ہندوستان ان کا وطن نہیں ہے - اور کیا اب وہ یہاں سے نکل کر کسی اور مُلک میں فاتحانہ و ملوکانہ زندگی بسر کرنے کی توقع قائم کر سکتے ہیں —— پھر جب یہ نہیں ہے تو کب اُن کی سمجھ میں آئے گا کہ جب سوال اقلیت و اکثریت کا پیدا ہوتا ہے تو اقلیت کی کامیابی "کم" کے مقابلہ میں ہمیشہ "کیف" سے ہوا کرتی ہے - مگر سنی شیعہ کی نزاع، وہابی و مقلد کا جھگڑا کب انھیں یہ سمجھنے کی مہلت دیتا ہے —— انھیں اپنے ہی پاؤں پر کلھاڑی مارنے سے کہاں فرصت ہے کہ وہ درخت کی طرف متوجہ ہوں

(۶) و (۷) رہ گئے آپ کے دو آخری حقائق کہ نگار کی تحریریں مُلک کے نوجوانوں کو گستاخ، گمراہ و بیکار بنا رہی ہیں اور خدا اس علم سے محفوظ رکھے جو شر اور گمراہی پھیلانے والا ہے - سو ان کے متعلق میں سوائے اس کے کیا کہہ سکتا ہوں کہ

من از آتش دخاں بینم تو آتش از دخاں بینی

نقطۂ نظر کا اختلاف ہے، کارگاہِ عمل کا اختلاف ہے، تعبیر و استنتاج کا اختلاف ہے - آپ جس چیز کو گستاخی سمجھتے ہیں وہ میرے نزدیک آزادیٔ ضمیر ہے - جوہر انسان کا فطری حق ہے اور جسے آپ گمراہی سمجھتے ہیں - میرے نزدیک وہی راہ

"کعبۂ مقصود" تک پہونچانے والی ہے
اگر میرا یہ مسلک کہ

میانِ کعبہ و بتخانہ راہے ست

واقعی فتنہ و فساد پھیلانے والا ہے تو میں صرف یہ عرض کروں گا

خدا گواہ اگر جرم ما ہمیں عشق ست
گناہِ گبر و مسلماں بہ جرم ما بخشند

امن و سکون کا درس دینے والے حضرات کا بھی حال مجھے معلوم ہے اور اُن علمبرداران مذہب کا بھی جو اپنے آپ کو "حاملانِ عرش" باور کرتے ہیں۔ اس لئے آپ کیوں مجھے اس بزم میں شرکت کی دعوت دیتے ہیں جہاں بقول عراقی

"ہمہ یافتم دغائی"

کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ آہ

مرہم از لبہاش می جویند بر جانِ فگار
وائے بر ریشے کہ آن را از نمک مرہم کنند

زخ (پٹیالہ) سے

۱۶ر فروری کو تحریر گرامی فردوس نظر ہوئی ـــــ لیکن حیران ہوں جواب کیونکر دوں۔ نگار میں اس کی اشاعت مناسب نہیں اور پتہ غیر معلوم!

اس صورت میں زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتا ہوں کہ نگار کے ذریعہ سے اس کے پہونچ جانے کی اطلاع آپ کو دے دوں اور اس وقت کا منتظر رہوں جب مراسلت کے لئے آپ اپنے پتہ سے آگاہ فرمائیں۔ تاہم فی الحال اس قدر کہدینے میں کوئی حرج نہیں کہ

تو پندار کہ ایں زمزمہ بے سازے ہست
گوش نزدیک لبم آر کہ آوازے ہست

نیاز

انسان

پر افشاں سرمدی نغمے مرے بربط کے تاروں میں
نشاطِ جاوداں میرے گلستاں کی بہاروں میں

مری منت کشِ احساس ہے آسائشِ گیتی
ہَوا میں تازگی ، رقصِ مسلسل آبشاروں میں

مری موجِ تبسم ، جلوہ دیتی ہے گلستاں کو
مری برقِ تجلّی ، مسکراتی ہے ستاروں میں

مرے ابرِ کرم سے زندگی ہے مستعار اس کی
وہ موجِ رنگ محوِ رقص ہے جو لالہ زاروں میں

زمیں کیا، آسماں کیا، اور ان کی داستاں کیسی!!
یہ میرا ذکر فطرت کر رہی ہے استعاروں میں

غلط کیا ہے ، جو خود بینی مرا آئین ہستی ہے
کہ ہے خود حُسنِ پنہاں بھی تو میرے بیقراروں میں

مری عظمت کو یہ خاکِ پریشاں کیا سمجھ سکتی!
فلک پر بھی تو کوئی تھا نہ میرے رازداروں میں

امینِ سرِ پنہاں ، آرزوئے قلبِ دوراں ہوں
فرشتے جس کو سجدہ کر چکے ہیں، میں وہ انساں ہوں

اجل کیا ہے ، فضائے زندگی کا بے کراں ہونا
خزاں، یعنی نئے جلووں سے نظمِ گلستاں ہونا

پہنچ سکتا نہیں دستِ حوادث ، میرے داماں تک
سکونِ موج ہے ، بیتاب رہنا، پرفشاں ہونا

بنی سرنامۂ تکمیل پروانوں کی بیتابی!
نشاطِ روح ہے اِس بزم میں آتش بجاں ہونا

مری تعمیر ہے کاشانۂ ہستی کی ویرانی
شبک روحی کا اک عنواں ہے میرا سرگراں ہونا

جھکا سکتی نہیں میری جبیں دنیا کی رعنائی
کہاں میں اور کہاں سرگشتۂ سود و زیاں ہونا

ترا اک کھیل ہے جوشِ ہجومِ جہل و نادانی
ابھی باقی ہے اسرارِ حقیقت کا عیاں ہونا

تباہی کے علم لہرا چکے پہنائے گیتی میں
یہ موجِ ناتواں اب چاہتی ہے بیکراں ہونا

تغیر کے مناظر ذرّے ذرّے سے نمایاں ہیں
زمیں سے آسماں تک مستقل آثارِ طوفاں ہیں

ارادہ ہے کہ اسرارِ نہاں کو برملا کر دوں
جہاں کو جاودانی عشرتوں سے آشنا کر دوں

سنوار دوں اک نئے انداز سے بکھری ہوئی زلفیں
عروسِ دہر کے جلووں کو پھر صبر آزما کر دوں

بہت فرسودۂ ایام ہے ترتیب گیتی کی — اب اجزائے کہن کو نذرِ سیلاب فنا کردوں
اُٹھاؤں پہلے طوفاں جس سے عالم خاک ہوجائے — پھر اس طوفانِ بربادی کو جولان صبا کردوں
محبت عہد نو میں نامۂ ہستی کا عنواں ہو — شبوں کو صبح کے مانند رنگیں ماجرا کردوں
ہر اک ذرّے سے پھوٹیں سرمدی انداز کے چشمے — فنا کے دام سے ابنائے گیتی کو رہا کردوں
مٹا کر تفرقے مزدوری و سرمایہ داری کے — علم حریتِ کامل کے دُنیا میں بپا کردوں

رگِ افسردۂ ہستی میں روحِ بے قرار آئے
گلوں کی طرح ذرّے مسکرائیں وہ بہار آئے

علی اختر (اختر)

مجموعۂ استفسار و جواب

ایکہزار صفحات کا گنجینۂ علم و ادب طیّار ہو رہا ہے اور اعلان کیا گیا تھا کہ عہ جسکی قیمت پیشگی آجائے گی اس کو یہ مجموعہ اسی قیمت میں دیدیا جائے گا۔ چونکہ اعلان کی میعاد ختم ہوگئی ہے اس لئے اب کوئی صاحب عہ بھیجکر اپنا نام درج نہ کرائیں

طیّاری کے بعد جو قیمت مقرر ہوگی، اس سے ایکروپیہ کم پر حسب معمول خریداران نگار کی خدمت میں یہ مجموعہ پیش کیا جائے گا۔ کم از کم پانچ روپیہ قیمت کا اندازہ کیا جاتا ہے

منیجر نگار لکھنؤ

خوابستان محبت

کیطرف

بس ایک بار ——— خدا کے لئے وہیں لے چل !
جہاں خلش کو سکونِ عظیم کہتے ہیں
جہاں سراب کو موجِ شمیم کہتے ہیں
جہاں ، نگاہ کو برقِ کلیم کہتے ہیں
بس ایک بار ——— خدا کے لئے وہیں لے چل !
وہ شہر جس کی زمیں آسماں کا دل چھینے!!
ہر ایک راہ گذر — کہکشاں کا دل چھینے!
فضا : جہاں کی بہار جناں کا دل چھینے !
بس ایک بار ——— خدا کے لئے وہیں لے چل !
وہ صبح — آہ، وہ ناظورۂ نشاط فروش
وہ شام - آہ، وہ لیلائے میکدہ بردوش
وہ شہر — آہ وہ فردوس نار نوشا نوش
بس ایک بار خدا کے لئے ——— وہیں لے چل!
وہ نذر گاہِ تمنا — وہ آستانِ مراد
ہے ذرہ ذرہ جہاں — خضر کاروانِ مراد
جہاں کی خاک بھی ہے نقشِ گلفشانِ مراد
بس ایک بار — خدا کے لئے — وہیں لے چل !
جہاں "شباب" کو آئینہ دارِ نور کہیں!
جہاں — "شراب" کو نوبادۂ ظہور کہیں!
جہاں — "خمار" کو تقدیسِ چشمِ حور کہیں !
بس ایک بار ——— خدا کے لئے وہیں لے چل !
جہاں — نشاط کو اندیشۂ زوال نہیں !!
جہاں — خوشی کبھی شرمندۂ زوال نہیں!!
جہاں — حنائے کفِ پا بھی پائمال نہیں!!
بس ایک بار ——— خدا کے لئے — وہیں لے چل !
جہاں رواں ہیں شراب طہور کے چشمے
نشاطِ قدس کے دریا — سرور کے چشمے
جہاں ہیں رقص میں صہبائے نور کے چشمے
بس ایک بار — خدا کے لئے — وہیں لے چل !
وہ ارضِ قدس، جہاں پر فنا کا نام نہیں
جہاں طرب کے لئے غم کا التزام نہیں
جہاں کی شمع کو افسردگی سے کام نہیں
بس ایک بار — خدا کے لئے — وہیں لے چل !
سواد جس کا نمودِ وفائے لیلیٰ ہے
ہر ایک ذرہ جہاں کا دلِ زلیخا ہے
جہاں روشن نے محبت کا خواب دیکھا ہے
بس ایک بار خدا کے لئے وہیں لے چل !

روشن (صدیقی)

خواتین کے مطالعہ کی کتابیں

گوڈر کا لال — للعہ
شوکت آرا بیگم حصہ ۲ — ۲ے
" حصہ سوم — ۳ے
سعیدہ کے خطوط — عہ
پیاری سہیلی — ۱۰ر
نئی نویلی پیاری سہیلی — عہ
عورتوں کی انشا — عہ
انشائے نسواں — ۸ر
سیرۃ الکبریٰ — عہ
طرز زندگی حصہ اول — عکا
تذکرات تیموریہ — عکا
ازواج النبی — ۱۲ر
ازواج الانبیا — عہ
سیرۃ عائشہ صدیقہ — عکا
عفت المسلمات — عہ
سبیل الجنان — عکا
بچوں کی پرورش — عہ
حرز اطفال — عہ
تہذیب نسواں — عکا
بیوی کی تعلیم — عہ
بیوی کی تربیت — عہ
تربیت اطفال — ۱۲ر

فرائض مادری — ۱۲ر
افسانۂ نادر جہاں — عہ
اقبال دو بہن — عہ
حسن معاشرت — عہ
ایامیٰ — عہ
سولہ کہانیاں — ۱۲ر
سترہ کہانیاں — ۱۲ر
سولہ قصے — ۸ر
مراۃ العروس — ۸ر
نباۃ النشء — ۸ر
توبتہ النصوح — ۱۲ر
کنیز فاطمہ — ۸ر
پنکھڑیاں — ۸ر
نصیحت کا کرنپھول — ۸ر
برکات سلطانی — ۸ر
ابن الوقت — عہ
چند پند — ۴ر
منتخب الحکایات — ۴ر
تندرستی — عہ
حفظ صحت — عہ
طبیب نسواں — عہ
رہبر صحت — ۸ر

ناول، ڈرامے اور افسانے

قطرات اشک — عہ
جتندر ناتھ — عہ
وداع ظفر — عہ
یاسمین شام — عہ
طوفان اشک — عہ
شاہین دوراج — ۸ر
درس عشق — عہ
کروڑپتی چور — عہ
تین بندوق باز — عہ
کرشمۂ رقابت — ۸ر
انقلاب قسطنطنیہ — ۸ر
شاہد رعنا — عہ
وبڈپا کی سرگذشت — ۱۴ر
شگوفۂ محبت — ۷ر
نسوانی زندگی — ۸ر
دلاہنی نتھی
شمع خاموش
شب زندگی کامل — عکا
مودودہ — ۸ر
چندر کلا — ۸ر
گلستان خاتون — عہ
صبح زندگی — عہ
شام زندگی — عہ

سوہنی — ۱۲ر
وداع ظفر — عہ
یاسمین شام — عہ
طوفان اشک — عہ
شاہین دوراج — ۸ر
درس عشق — عہ
کروڑپتی چور — عہ
تین بندوق باز — عہ
کرشمۂ رقابت — ۸ر
انقلاب قسطنطنیہ — ۸ر
شاہد رعنا — عہ
وبڈپا کی سرگذشت — ۱۴ر
شگوفۂ محبت — ۷ر
نسوانی زندگی — ۸ر
دلاہنی نتھی
شمع خاموش
شب زندگی کامل — عکا
مودودہ — ۸ر
چندر کلا — ۸ر
گلستان خاتون — عہ
صبح زندگی — عہ
شام زندگی — عہ

قطرات اشک — عہ
جتندر ناتھ — عہ
بس کار دکھ — عہ
فسانۂ سعید — ۸ر
خوفناک ڈکیتی — عہ
سیلاب شک بالتصویر — عہ
بے زبان دوست — ۶ر
جمال ہم نشیں — عہ
تفسیر عصمت — عہ
جوہر قدامت — عہ
نائیہ غیبی — ۸ر
پراسرار قتل — عکا
اعلان آزادی — ۵ر
سرگذشت ہاجرہ — ۱۰ر
نوحہ زندگی — ۱۲ر
قلب حزیں — ۸ر
عروس کربلا — عہ
شہید مغرب — عہ
ماہ عجم — عہ
تیغ کمال — عہ
سراب مغرب — ۸ر
منازل السائرہ کامل — عکا

تاریخ و سوانحعمریاں

تاریخ مغرب — عکا
مختصر تاریخ اسلامی — ۸ر
" " حصہ ۲ — ۹ر
" " حصہ ۳ — ۱۰ر
" " حصہ ۴ — عہ
الصالحات — عہ
امت کی مائیں — عہ
الزہرا — ۱۲ر
اسوۂ حسنہ — ۸ر
ہندو شعراء — عہ
شونہار — عہ
سوانح اکبر الہ آبادی — عہ
سفرنامہ عراق — عہ
تاریخ افاغنہ — عہ
اسلام اور غیر مسلم — ۸ر
سیر المصنفین حصہ ۱ — عکا
" " حصہ ۲ — عہ
تاریخ اسلام ۵ جلد — ۴ر
اخبار الاندلس ۳ جلد — عکا
خلافت موحدین — للعہ
خلافت مولدین — عکا
عرب اور اسکا مستقبل — عہ

لغات و ادب

بازاری زبان — ۸ر
لغات سعیدی — للعہ
لغات کشوری — ۳ے
گنجینۂ تحقیق مجلد — للعہ
سبز اللغات فارسی — عکا
محاورات نسواں — ۸ر
جواہر اللغات — ۱۲ر
گوہر اللغات — ۱۲ر
چراغ سخن — عہ
دکھنی لغت — ۸ر
جواہرات کلیات نظیر — عہ
عزیز اللغات — عکا
تذکرۂ رنجتی — عہ
تاریخ اردوے قدیم — عہ
دکن میں اردو — عکا
منتخب کلام ہندی — عکا
رباعیات عمر خیام — عکا
منتخب کلام ہندی — عکا
اردو کے اسالیب بیان — عکا
تصریح الاغلاط — ۴ر
مفید اردو — ۵ر
نور اللغات ۴ جلد — للعہ

دواوین فارسی

دیوان شمس تبریز — عہ
کلیات عرفی — ۱۲ر
دیوان حافظ — عہ
دیوان بیدل — ۱۲ر
دیوان عرفی — ۱۲ر
کلیات جامی — عکا

کلیات غالب — عہ
کلیات صائب — عہ
دیوان ناصر علی — ۷ر
کلیات سعدی — عہ
کلیات حزیں — ۱۲ر
دیوان عنصری — ۱۴ر

دیوان غنی کشمیری — ۶ر
دیوان ہلالی — ۷ر
اسرار خودی و رموز ہے
زبور عجم — ہے
پیام شرق — ہے
قصائد عزیز مجلد — ہے

دواوین اردو

کلیات ظفر — عکا
کلیات مومن — ۱۴ر
دیوان ناسخ — عہ
کلیات میر — ۸ر
کلیات سودا — ۸ر
کلیات انشاء — عہ

کلیات نظیر اکبر آبادی — عہ
گلزار داغ — عہ
دیوان رند — ۱۲ر
دیوان ذوق — ۸ر
گلکدہ عزیز — عہ
مراۃ الغیب — عہ

صنمخانۂ عشق — عکا
فریاد داغ — عہ
عالم خیال بالتصویر — عہ
دیوان شہیدی — ۴ر
کلیات اکبر الہ آبادی — للعہ
نغمۂ دل شاہجہانپوری — عہ

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱۰۴

ذیل کی کتابیں نگار بک ایجنسی سے طلب فرمائیے

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱۰۴

تذکرہ و تاریخ

- پیغمبر اعظم ۸ر
- شب معراج عہ
- سراج منیر عہ
- پیغمبر عالم ۸ر
- سوانح حضرت رسول عہ
- سید المرسلین ۸ر
- حیدر کرار ۸ر
- سبزہ الصدیق عا
- عمر ابن خطاب ۸ر
- ابوبکر صدیق عہ
- ائمہ اسلام ۱۲ر
- الجیب عا
- عمر بن عبدالعزیز ۸ر
- دولت غار دفیہ عا
- مکمل سوانح زیب النسا بیگم عہ
- تذکرہ اولیا عا
- تذکرہ اولیائے ہند للعہ
- مراۃ الکونین ۸ر
- قصص الانبیا مکمل ۱۲ر
- سفرنامہ چین عا
- تلخیص تواریخ عہ
- خانوادہ جنت ۸ر
- مختارات الصوفیہ عہ
- خواتین انگورہ عہ
- شاہیر نسواں عہ
- مشاہیر ہند عا
- خندات فیجوریہ عا
- بیگمات بنگال ۷ر

جاسوسی کے ناول

- شرلاک ہولمز عا
- محاصرہ پیرس ۸ر
- شیخ چلی ۴ر
- بہرام کی واپسی ۴ر
- انقلاب فرانس عہ
- بحری قزاق عہ
- خطرناک جاسوس ۸ر
- ترکی حرم سرا ۸ر
- جنگ طرابلس ۴ر
- بہرام چور ۱۲ر
- زرپرست ۱۲ر
- کنجی کا راز ۸ر
- عبدالرحمن ناصر عہ
- عروس مصر عا
- سیلاب خون ۸ر
- سیاحت زمین ۴ر
- سیاحت ہوا عہ
- نازنین مراکش ۸ر
- سمندر کی سیر ۸ر
- اسرار المشویزم ۴ر
- روح لیلیٰ ۴ر
- امین بیگ ۱۲ر
- حجاج بن یوسف ۴ر
- یوسف پاشا ۴ر
- انقلاب عثمانی ۴ر
- بہرام کی رہائی ۴ر
- بہرام کی آزادی ۱۲ر
- بہرام کی سرگذشت ۴ر

مراثی

- مراثی دبیر ۸ر
- مراثی انیس کامل ۸ر
- مراثی ضمیر عہ
- مراثی مونس ۱۲ر
- مراثی دلگیر ۱۲ر

عجائب و غرائب

- عجائب مخلوقات تصویر رنگین ۱۲ر
- بلا تصویر ۸ر
- مجمع الفنون ۸ر
- طلسم فرنگ ۸ر
- کارخانۂ عالم عہ

رنالڈز کے ناولوں کے ترجمے

- الہ دین دلربا ۴ر
- فریب حسن ۴ر
- سوز عشق ۸ر
- روز الیمبرٹ ۸ر
- نادل اسرار ۸ر
- شام جوانی ۴ر
- مرم سرا ۴ر

ناول سجاد حسین

- احمق الذہبی ۸ر
- حاجی بغلول ۸ر
- پیاری دنیا ۸ر
- کایا پلٹ ۸ر
- مٹھی چھری ۸ر
- طرح دار لونڈی عہ
- طلسمی فانوس ۱۲ر

ناول جوالا پرشاد

- مزاقالنی ۱۰ر
- مار آستین ۱۰ر
- بنگالی دوشیزہ ۱۲ر
- معشوقہ فرنگ ۸ر
- پرتاب ۱۲ر
- رد ہنی ۱۰ر

ناول سرشار

- سیر کہسار ۸ر
- خدائی فوجدار ۸ر
- جام سرشار ۸ر
- الف لیلہ بطرز ناول عہ
- کامنی ۸ر
- سوانح عمر دھیار ۸ر

ظفر عمر بی اے

- چوروں کا کلب ۸ر
- نیلی چھتری ۸ر
- بہرام کی گرفتاری عہ

ادبی کتابیں

- مکمل شرح دیوان غالب ۸ر
- بزم خیال عہ
- مشاطۂ سخن عہ
- مکاتیب محمد بن الملک ۸ر

تذکرۃ الشعراء

- تذکرۂ حسینی ۱۲ر
- گلشن بیخار ۱۰ر
- سراپائے سخن عہ
- سوانح نظیر اکبرآبادی ۸ر

ناول شرر

- جلید بغدادی عہ
- محذورات ۸ر
- مجربائے حق للعہ
- لعبت چین عہ
- فاتح و مفتوح ۸ر
- ایک خرمی ۸ر
- ایام عرب ۸ر
- قیس و لیلیٰ عہ
- یوسف و زلیخا ۸ر
- زوال بغداد ۸ر
- حسن کا ڈاکو ۸ر
- دربار حرام پور ۱۰ر
- مینا بازار عہ
- عقد ثریا ۸ر
- رومۃ الکبریٰ ۸ر
- فلپینا ۸ر
- شوخین ملکہ ۸ر

مولانا شبلی نعمانی

- سیرۃ النبی جلد اول ۸ر
- " " دوم للعہ
- " " سوم ۸ر
- الفاروق ۸ر
- الغزالی ۸ر
- المامون ۸ر
- رسائل شبلی ۸ر
- موازنہ انیس و دبیر ۸ر
- کلام شبلی اردو ۸ر
- الکلام ۸ر
- علم الکلام ۸ر
- شعر العجم جلد اول ۸ر
- " " دوم ۸ر
- " " سوم ۸ر
- " " چہارم ۸ر
- " " پنجم ۸ر

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

مطبوعہ گلشن آرٹ پریس لکھنؤ